حقیقتِ خلافت

مرتبہ

خاکسار قاضی سراج الدین احمدؔ

بیرسٹرایٹ لا۔ راولپنڈی

جسے مؤلف نے

مطبع روز بازار امرتسر میں باہتمام شیخ عبدالعزیز مینیجر

چھپوا کر شائع کیا

روز بازار الیکٹرک پریس ہال بازار امرتسر میں باہتمام شیخ عبدالعزیز مینیجر چھپا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع ثانی

سرسید احمد خان بہادر رحمۃ اللہ علیہ نے جو تاریخ اسلام میں مسلمانوں کے سب سے بڑے مصلح کہلانے کے مستحق ہیں اور جو عام طور پر بانی علیگڈھ کالج ہونے کی حیثیت سے مشہور ہیں ۱۸۹۷ء میں ٹرکی اور یونان کے جنگ کے خاتمہ پر چند مضامین مسئلہ خلافت پر تحریر کئے تھے جو علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں چھپے تھے اور میرے پاس محفوظ تھے کیونکہ میں نے سرسید کی سوانح عمری لکھنے کی غرض سے ان کی تمام تحریروں کو جمع کیا تھا۔

سرسید کے اِن مضامین کو میں نے جنوری ۱۹۱۶ء میں معہ ان کے دو اور مضامین کے جو مسئلہ خلافت سے بالواسطہ تعلق رکھتے تھے اور تہذیب الاخلاق میں چھپ چکے تھے معہ اپنی ایک تحریر کے جس میں اس مسئلہ کی مزید تشریح کی گئی تھی چھاپ دیا تھا۔ جو ضرورت مجھے اس امر کیطرف داعی ہوئی وہ سرسید کے مشن کی تائید تھی۔ کیونکہ مذہب اسلام کی تعلیم کی بنا پر اور اس خیال سے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا بقا صحیح طور پر مستحکم انگریزی سلطنت کے ساتھ وابستہ سمجھتا تھا۔ سلطنت انگریزی کی خدمت کرنا اس نے مسلمانان ہندوستان کا ایک مذہبی فرض قرار دیا تھا۔ اور ۱۸۵۷ء ہندوستان کے غدر کے ایام میں خود اسپر عمل کر کے دکھایا تھا۔ پس میں نے ان مضامین کو اس غرض سے چھاپا کہ یورپ کے جنگ عظیم میں جبکہ مسلمانانِ ہندوستان کے لئے سلطنت کی وفادارانہ خدمت کرنے کا ایک موقع پیدا ہو گیا تھا۔ کوئی چیز ان کو اپنے اس فرض کے ادا کرنے میں مانع اور مزاحم نہ ہو۔ اور خدا نے مسلمانانِ ہندوستان کو توفیق عطا کی کہ انھوں نے اپنا یہ فرض قابل تعریف طریق پر ادا کر دیا۔

سرسید کو ان مضامین کو لکھے ہوئے بائیس برس سے زائد گزر گئے ہیں اور مجھے اِن

مضامین کو دوبارہ شایع کئے ہوئے چار برس سے زائد عرصہ گذر گیا۔ اس تمام عرصہ میں کسی شخص کو اِن مضامین سے اختلاف کرنے یا نفس مضمون سے انکار کرنے کی جرأت نہ ہوئی صرف گذشتہ چند مہینوں میں جبکہ ترکوں کی خلافت کا جھنڈا چند ایسے مسلمانوں نے جو انگریزی سلطنت سے ناراض ہیں ہندوستان میں کھڑا کیا ہے۔ اور چند اُسی وضع کے اخبار نویس ان کے ہم نوا بنگئے ہیں اور ناواقف اور جاہل مسلمانان ہندوستان کو گمراہ کرنا شروع کیا ہے۔ میرے شائع کردہ رسالہ کے متعلق بعض اخبارات نے اظہار رائے کیا ہے۔ اور کلکتہ کے ایک مولوی صاحب معروف ابوالکلام آزاد نے مضمونِ خلافت پر ایک رسالہ شایع کیا ہے۔ اخبارات کی اِن تحریروں اور مولوی آزاد صاحب کے رسالہ کے پڑھنے سے مجھ کو کامل یقین ہوگیا ہے کہ سرسید مرحوم کی رائے مسئلہ خلافت پر صرف سچی ہی نہیں ہے بلکہ ایسی ہے کہ اسکا کوئی جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ اخبار نویسوں میں سے تو کسی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ نفس مضمون کا کچھ جواب دیں۔ بعض نے تو صرف یہ کہکر ٹال دیا ہے کہ چونکہ سرسید احمد خان مرحوم مسلمانوں کی تمام توجہ انکی تعلیمی ترقی پر قائم رکھنا چاہتے تھے اسلئے خلافت کے وجود سے اُنھوں نے انکار کردیا ہے۔ ایسی بددیانتی کا الزام سرسید مغفور پر وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو دیانتداری کی تعریف سے ناآشنا ہیں اور اس بزرگ شخص کی اخلاقی جرأت اور چالیس سال تک مسلمانوں کے غلط عقائد کی اصلاح کرنے کی کوششوں میں سخت مخالفتوں کے مقابلہ میں نہایت استحکام کے ساتھ اپنی رائوں پر قائم رہنے کے کارناموں سے بے خبر ہیں۔

بعض اور اخبار نویسوں نے اس مضمون کے متعلق صرف اتنا کہدینا کافی سمجھا ہے کہ چونکہ سرسید کے مذہبی عقائد سے مسلمانوں کو اتفاق نہیں تھا اور انکو اپنا مذہبی پیشوا نہیں سمجھتے تھے اس وجہ سے ان کو خلافت کے متعلق انکی رائے کی پیروی کرنا ضروری نہیں ہے۔ سرسید کے مذہبی عقائد کے متعلق مسلمانوں میں دو جماعتیں پائی گئی ہیں۔ ایک تو وہ جو اسکے اپنے مشن کا کام شروع کرنے کے وقت اسکو کافر سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے اسکو مسلمانوں کو عیسائی یا لامذہب بنانا منظور رہا ہے وہ تو سرسید کے ہر ایک مذہبی عقیدہ سے منکر تھے خواہ وہ خدا کی وحدانیت کے متعلق ہو۔ اور دوسرا قسم اُن لوگوں کا تھا جس نے آخرکار اسکو مسلمانوں کا خیرخواہ اور ریفارمر قبول کیا۔ اُن میں سے بعض نے اسکے بعض مذہبی عقائد سے اختلاف کیا لیکن دلائل اور وجوہات کے ساتھ۔ گو آخرکار انکو سرسید کے ساتھ اتفاق ہی

کرنا پڑا۔ یہ اخبار نویس جو خلافت کے بارہ میں سرسید کی رائے کو قبول نہیں کرتے ہیں غالباً پہلی جماعت کے لوگوں میں سے ہیں ورنہ اپنے اختلاف کے واسطے وہ کوئی دلیل پیش کرتے۔

مولوی ابوالکلام آزاد نے جو رسالہ خلافت کے مضمون پر لکھا ہے اس میں سرسید کی رائے کا نہ تو کہیں ذکر ہے اور نہ اسکا کوئی جواب دیا گیا ہے۔ لیکن ہم پھر بھی اسکی نہایت قدر کرتے اگر ہم یہ باور کر سکتے کہ اس عالم شخص نے تحقیق حق کی غرض سے یہ رسالہ لکھا ہے جسقدر زیادہ ہم نے اس تحریر پر غور کیا ہے اسی قدر زیادہ یقین اس امر کا ہوتا گیا ہے کہ یہ رسالہ انہوں نے مسلمانان ہندوستان میں اشتعال پیدا کرنے اور مسلمانوں کے دلوں میں سلطنت کیطرف سے بدگمانی پیدا کرنے کی غرض سے لکھا ہے اور اسکو تمام تر محض لفاظی پر مبنی کیا ہے۔ اگر مولوی صاحب کو اپنی معرکہ آرائی الفاظ پر ناز ہو تو وہ بالکل بجا ہوگا۔ لیکن اگر وہ یہ سمجھتے ہوں کہ اس سے وہ ہر ایک شخص کو مرعوب کر لیں گے یا عبارت آرائی سے حقیقت واقع کو چھپا سکیں گے تو یہ انکا خیال غلط ہے۔ اُنہوں نے اپنے اس رسالہ میں اخفائے واقعات تاریخی۔ بے حد مبالغہ اور تاریخی واقعات کے متعلق غلط بیانی کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ ایسی تحریر کا جواب دینے کی کوشش کرنا محض وقت کو ضائع کرنا ہے لیکن ہم تمثیل کے طور پر چند باتوں کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔

جو لوگ ترکوں کی خلافت کے مدعی ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مذہب اسلام کے رُو سے ایک ہی خلافت ایک وقت میں ہو سکتی ہے اور وہ خلافت ایسی ہو کہ اس کو دُنیوی اقتدار یعنی سلطنت بھی حاصل ہو۔ ان کے دعوٰی کے برخلاف دو مہلک تاریخی واقعات ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک ہی وقت میں تین خلافتیں ایک بغداد میں بنی عباس کی۔ دوسری مصر میں علویین کی۔ اور تیسری اموی خلافت اندلس (ہسپانیہ) میں۔ یہ تینوں خلافتیں بجائے خود خود مختار تھیں۔ کوئی ایک ان میں سے دوسرے کی فوقیت تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اور اپنے اپنے جداگانہ قوانین فقہ اپنے اپنے علاقوں میں جاری کر رکھے تھے۔ یہ خلافتیں صدیوں تک قائم رہیں اور ان کے تمام والیانِ ملک اپنے عہد حکومت میں خلیفہ کہلاتے رہے اور اپنی اپنی رعایا سے خلیفہ تسلیم کئے جاتے رہے۔ مولوی آزاد صاحب نے اس کیفیت اور ان واقعات کا ذکر اپنے رسالہ میں نہیں کیا ہے

اور نہ علویین مصر اور بنی امیہ اندلس کی خلافتوں کو اس جدول میں درج کیا ہے جو رسالہ کے خاتمہ پر چھاپی گئی ہے۔

اسی طرح مصر کی خلافت عباسیہ کی نسبت جو قریب تین سو سال تک قائم رکھی گئی صراحتہً اس امر کے بیان کرنے سے اغماض کیا گیا ہے کہ ان خلیفوں کی کوئی سلطنت اور حکومت نہیں تھی۔ اور نہ ان کو امورِ سلطنت میں کوئی دخل تھا۔ البتہ دو مقامات پر نہایت دبے الفاظ میں اسکا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ اس کو عباسیہ بغداد کا غبار خلافت اور دوسری جگہ نقشِ قدم کہہ دیا ہے۔ لیکن حقیقتِ واقع کو چھپایا ہے۔ کیونکہ اس سے نوع خلافت مندعویہ میں نقص واقع ہوتا ہے۔ ہم ان خلفائے عباسیہ مصر کے متعلق مولانا شبلی مرحوم مشہور مؤرخ کے مضمون خلافت سے جو اس رسالہ میں ملیگا حسب ذیل الفاظ نقل کر دینے سے انکی اس کیفیت کو صاف کر دیتے ہیں۔

"یہ خلفا (عباسیہ مصر) اگرچہ اسقدر بے اختیار اور بے حقیقت تھے کہ ان کو بجز مقررہ وظیفہ کے کسی قسم کی حکومت حاصل نہ تھی۔ تاہم مذہبی عظمت یہ تھی کہ بادشاہِ وقت ہمیشہ ان کے آگے سر جھکاتا تھا۔"

یہ ایک نمونہ ہے مولوی صاحب کی دیانت داری اور نیک نیتی کا۔ حقیقت میں وہ مسلمانوں کی جہالت اور اپنی قومی تاریخ کی ناواقفیت سے یہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ جس بات کو اپنے مدعا کے واسطے مفید سمجھتے ہیں بے دریغ کہہ دیتے ہیں۔ خواہ تاریخی حیثیت سے وہ جھوٹی ہو یا سچی۔ مثلاً وہ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ "۹۲۳ھ میں سلطان سلیم خان اول نے مصر و شام پر قبضہ کیا اور آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے اسکے ہاتھ پر بیعت کر کے تمام حقوق و امتیازاتِ خلافت سپرد کر دئے۔"

ان الفاظ کا مقابلہ کیجئے مولانا مولوی شبلی مرحوم کے الفاظ سے جو حسب ذیل ہیں:

"سلطان سلیم اول نے جب مصر فتح کیا تو اُس وقت وہاں عباسی خاندان کا ایک برائے نام خلیفہ موجود تھا جسکا نام المتوکل تھا۔ سلطان سلیم اسکو بجبر قسطنطنیہ لایا اور اسکو مجبور کیا کہ خلافت کے لقب سے دست بردار ہو جائے۔ اور یہ لقب سلیم کے نام منتقل کر دے متوکل اگرچہ اسپر راضی نہ تھا لیکن مجبوراً اسکو قبول کرنا پڑا۔ چنانچہ مسجد ایا صوفیہ میں جا کر اس نے اسبات کا اعلان کیا اور یہ پہلا دن ہے کہ ٹرکی خاندان کے ساتھ یہ فرضی لقب

اضافہ کیا گیا۔ یہ واقع اگرچہ ظاہر مضحکہ آمیز ہے لیکن خود ترک مورخین اسکے معترف ہیں۔

سلیم نے جس طریق سے مصر کا قبضہ حاصل کیا تھا اور لاکھوں مسلمانوں کا خون بہا کر مملوکوں کی عظیم الشان سلطنت کو برباد کیا تھا اسکا ذکر ہمارے رسالہ میں ملیگا۔ وہ مولوی آزاد صاحب نے بہت آسانی سے فراموش کر دیا ہے۔ لیکن مولوی صاحب نے جو ایک اور عجیب بات اپنے رسالہ میں لکھ ڈالی ہے وہ یہ ہے کہ سلطان سلیم کی سلطنت کو بحیثیت ایک مرکزی خلافت کے تمام دیگر اسلامی سلطنتیں تسلیم کرتی تھیں جن میں ایران کی سلطنت صفویہ بھی شامل تھی۔ لیکن مولوی صاحب کو یہ یاد نہیں رہا کہ شاہ اسمٰعیل صفوی جسکی پیاری ملکہ کو سلیم پکڑ لایا تھا اور ملکہ کو واپس دیدینے کے متعلق اسکی تمام التجاؤں کو رد کر کے اسکو ایک سپاہی کو دے دیا تھا وہ سلطان سلیم کی سلطنت کو کبھی مرکزی خلافت تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ اور نیز اس وجہ سے کہ ایرانی سلطنت اور رعایا شیعہ تھی جو کسی خلیفہ کو نہیں مانتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور جھوٹی بات جو مولوی آزاد صاحب نے ترکوں کو سراہتے سراہتے آسمان تک بلکہ رتبۂ خدائی تک پہونچا دینے اور مسلمانوں کے جذبات کو دبا کر انکی طرف مائل کرنیکی غرض سے نہایت بے باکی سے کہہ ڈالی ہے وہ یہ ہے کہ ”صدیوں سے اسلام اور بلادِ اسلام کی حفاظت کی تلوار انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ صدیوں سے صرف انہی کا سینہ اسلام کی راہ میں زخمی ہے“۔ الخ۔

لیکن جو لوگ مسلمانوں کی تاریخ سے واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ الفاظ کسقدر خلافِ حقیقت ہیں۔ ترکوں نے اپنے تمام زمانہ حکومت میں کسی مخصوص طریقہ سے کوئی خدمت اسلام نہیں کی۔ اشاعت اسلام کی غرض سے جو اصل خدمتِ اسلام ہے کوئی سلسلہ تبلیغ اسلام کا اختیار نہیں کیا بلکہ ان کے افعال و اعمال سے جو حد اعتدال سے گذرے ہوئے تھے اور خلافِ شریعت اسلام تھے۔ غیر مسلم یورپ کو اسلام کی نسبت بدگمانی اور نکتہ چینی کا موقع ملا ہے۔ البتہ اُنہوں نے تلوار خوب ماری ہے لیکن وہ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے برخلاف ماری ہے۔ جہاں لاکھوں یورپ کے عیسائیوں کو انہوں نے لڑائیوں میں قتل کیا وہاں لاکھوں مصری اور ایرانی مسلمانوں کو بھی تلوار کی گھاٹ اُتار دیا۔

باقی رہی حفاظت بلادِ اسلام۔ اسکے متعلق اگر مولوی آزاد صاحب ذکر نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔
کیونکہ اس اعتبار سے ترک ایک بہت بڑی معصیت کے ذمہ دار قرار پاچکے ہیں۔ اندلس
(ہسپانیہ) کے مسلمان جب اس ملک کے عیسائیوں سے مغلوب ہوتے جارہے تھے
تو انھوں نے ترکوں سے امداد کی درخواست کی۔ یہ زمانہ ترکی سلطنت کے کمال عروج کا تھا۔
اور سب سے زبردست بحری طاقت اس وقت ترکوں ہی کی تھی۔ لیکن ترکوں نے انکی
فریاد پر ذرا بھی التفات نہ کیا اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سرزمین جس پر مسلمانوں نے پانچ چھ
صدیوں تک نہایت شان وشوکت کی سلطنت کی تھی آج اُس زمین میں ایک متنفس
خدائے واحد کا نام لینے والا موجود نہیں ہے۔ اِنکا خون کس کی گردن پر ہے۔
خلافت کا دعویٰ تو درکنار اسلامی ہمدردی کا یہ تقاضا ہونا چاہئے تھا کہ وہ ان لکھوکھا
مسلمانوں کو ہسپانی عیسائیوں کے ظلم وستم کا شکار ہو جانے سے بچاتے۔
ترکوں کے زمانہ سلطنت میں اسلامی دنیا میں سینکڑوں تغیرات ہو گئے۔
کئی مسلمانوں کی بادشاہیاں بگڑ گئیں اور کسی نے آجتک نہیں سُنا ہے کہ ان میں سے
کس کو ترکوں نے امداد دی اور انکی حفاظت کرنے کی کوئی کوشش کی۔ ایسی بے بُنیاد
باتیں کہنے سے جنکی تاریخی اصلیت کوئی نہیں ہے کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟۔
مولوی آزاد صاحب کے رسالہ میں جن حالات اور کیفیات سے بحث کی گئی ہے
وہ تمام وہ ہیں جو اسلامی حکومتوں اور انکی رعایا سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمام رسالہ میں
ایک لفظ بھی اسبارہ میں نہیں لکھا ہے کہ جو مسلمان غیر مسلم حکومتوں کی رعایا ہوں
انکی بابت بھی کوئی مذہبی حکم ہے یا نہیں۔ یہ بات کہ سیلون کے مسلمان ہندوستان
اور ترکی کے مسلمان بادشاہ کے لئے دعا کرتے تھے یا ہندوستان کے کسی بادشاہ
نے مصری خلیفہ کیطرف سے خط اور خلعت حاصل کرنے پر بڑی خوشی منائی تھی اس سے
کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اگر مولوی آزاد صاحب کا فتویٰ یہ ہے کہ وہ تمام مسلمان
جو فرانس۔ روس۔ انگلستان۔ چین وغیرہ کے ماتحت ہیں انکو اپنی حکومتوں کی تابعداری
نہیں کرنی چاہئے بلکہ کسی اسلامی سلطنت کی خواہ وہ ترکوں کی ہو یا عربوں کی تو وہ اسلام
کو ایک نہایت ناقص اور نامعقول مذہب بنا رہے ہیں جس پر نہ کبھی مسلمانانِ عالم نے
عمل کیا ہے اور نہ کرینگے۔ کیونکہ وہ ناممکن العمل ہے۔

مسلمانوں کا طریق عمل تو اسبارہ میں اسی جنگ یورپ میں دنیا نے دیکھ لیا ہے اور وہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں سے ہی تعلق نہیں رکھتا بلکہ فرانس اور روس کی مسلمان رعایا نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ وہ ہر ایک ملک سے لاکھوں کی تعداد میں میدان جنگ میں جرمنی اور ترکی کے برخلاف لڑنے کے واسطے گئے اور لڑے۔ اور تمام زمانہ جنگ میں نہ تو اِن مختلف ممالک کے مسلمانوں نے یہ امر محسوس کیا کہ وہ کوئی خلافِ مذہب فعل کر رہے ہیں اور نہ ہندوستان یا کسی اَور ملک کے مسلمان علما نے یہ کہا کہ مسلمانوں کو ترکوں کے خلاف جنگ کرنے کے واسطے نہیں جانا چاہیئے تھا۔ وجہ اسکی ظاہر ہے۔ اول تو یہ کہ ہر ایک ملک کے مسلمان اپنی اپنی سلطنت کی نسبت اپنے فرض اطاعت اور وفاداری کو جانتے تھے۔ اور دوم اس امر سے واقف تھے کہ یہ ایک دنیاداری کی لڑائی ہے جو یورپ کی عیسائی سلطنتوں کے درمیان جاری ہوئی ہے۔ اور ترکوں نے جو جرمنی کی رعایا نہیں ہیں اگر جرمنی کی حمایت اختیار کی ہے تو دیگر ممالک کے مسلمانوں کے واسطے فرض ہے کہ وہ اپنی اپنی سلطنت کی خدمت شریک جنگ ہو کر کریں۔

اب ترکوں کے طرزِ عمل پر غور کرو کہ آیا اُنہوں نے اس امر کا احساس کیا کہ انکا سلطان مسلمانانِ عالم کا خلیفہ ہے اور انکو اپنی روش میں اس امر کا لحاظ کرنا چاہیئے۔ اگر ایک لمحہ کے واسطے بھی یہ خیال ان کے دل میں گذرا ہوتا تو وہ جرمنی کی حمایت میں جسکی رعایا میں کوئی مسلمان نہیں ہے۔ اِن سلطنتوں کے برخلاف ہتھیار نہ اُٹھاتے جنکے زیر حکم کروڑوں مسلمان تھے۔

لیکن نہ تو مسلمانان عالم نے اور نہ ترکوں نے اس امر کو محسوس کیا اور جب لڑائی کا فیصلہ جرمنی اور ترکی کے برخلاف ہوگیا اور ہندوستان کے چار پانچ مسلمان جو زمانہ جنگ میں نظر بند تھے رہا کر دئے گئے تو انہوں نے مسلمانانِ ہندوستان کو مذہب اسلام کے ایسے مسائل بتانا شروع کئے جو اس سے پیشتر کروڑوں مسلمانوں اور انکے لاکھوں علما کے خواب و خیال میں نہیں تھے۔

جنگ یورپ کا انجام جو کچھ ہوا وہی خدا کو منظور تھا اور میں نے اپنے اس رسالہ کے خاتمہ کے الفاظ میں آغاز ۱۹۱۶ء میں لکھدیا تھا کہ ترکوں نے ایک مہلک غلطی کی ہے اور وہ اپنی سلطنت کو بگاڑ لیں گے۔

مولوی آزاد صاحب ترکوں کے استحقاقِ خلافت کے متعلق اَور سب امور کو چھوڑ کر

اسبات پر زور دیتے ہیں کہ یہی ایک مسلمانوں کی سب سے زیادہ طاقتور سلطنت ہے جو اسلام اور بلاد اسلام کی حفاظت کر سکتی ہے۔ یہ بات آج سے سو برس پیشتر بلاشبہ صحیح تھی لیکن گذشتہ صدی میں ظاہر ہو گیا کہ ترکوں میں روس کے مقابلہ کی طاقت نہیں تھی۔ اور اگر انگلستان اور فرانس اسکی مدد نہ کرتے تو ترکی سلطنت کبھی کی معدوم ہو چکی ہوتی۔ لیکن کیا کوئی ذی ہوش اور ذی شعور آدمی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ اسوقت ترکی حکومت میں یورپ کی متفقہ سلطنتوں یا کسی ایک بڑی سلطنت کا مقابلہ کرنے کی قابلیت موجود ہے۔ ہندوستان کے آدھی درجن سرگرم مسلمان یہ بات کہیں تو کہیں۔ لیکن خود ترکوں نے عہدنامۂ صلح کی ۱۱۔ اگست ۱۹۲۰ء کو تکمیل کر دینے اور اس پر دستخط کر دینے اور حجاز مصر۔ شام فلسطین اور عراق وغیرہ سے دست بردار ہو جانے سے اس امر کا اعتراف کر لیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ ایک نہایت افسوسناک واقع ہے۔ مگر خدا کی مرضی یہی تھی اور اسکے چھپانے اور حقیقتِ حال کو تسلیم نہ کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ ترکی میں بلاد اسلام اور مقامات مقدسہ کی حفاظت کرنے کی قابلیت بلاشبہ باقی رہجاتی اگر وہ اس جنگ میں غیر جانبداری کی وضع اختیار کر لیتی یا یورپ کی غالب سلطنتوں سے اسکی دوستانہ راہ و رسم قائم رہتی۔ لیکن ترکوں نے جو ناعاقبت اندیشی کی اور جسکا نتیجہ ایسا ہولناک پیدا ہوا اسکے لحاظ سے عربوں پر الزام لگانا کہ انہوں نے کیوں ایسا ہی نہیں کیا جیسا ترکوں نے کیا تھا۔ اور عربوں کی نسبت بد کلامی کرنا اور ان کو باغی کہنا یہ چند ہندوستان کے بے مغز مسلمانوں کا فعل ہو سکتا ہے۔ کیا یورپ کی غالب سلطنتوں کی دوستی کے بغیر کوئی حکومت بھی خواہ وہ ترکوں کی ہو۔ یا عربوں کی۔ حرمین الشریفین کی حفاظت کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ حرمین کا حافظ خود خدا ہے اور اسی نے انکی حفاظت کی یہ سبیل پیدا کر دی ہے۔

ہندوستان کے چند مسلمانوں سے جو ملک کے ناواقف مسلمانوں کو برافروختہ کر رہے ہیں پوچھا جائے کہ ان کی اب غرض کیا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہجرت کرنے کی تلقین کی اور اسکا جو کچھ نتیجہ ہوا ہے وہ سب نے دیکھ لیا۔ مسلمانوں کی لاکھوں روپیہ کی جائدادیں برباد ہو گئیں اور ہزارہا مسلمان غریب الوطنی کے مصائب میں مبتلا ہو گئے اور فاقوں سے مر رہے ہیں۔ اب ان کو عدمِ تعاون کا مشورہ دیا جاتا ہے جسکے اختیار کرنے

مسلمانانِ ہندوستان قطعاً برباد ہو جائیں گے اور انکا کوئی ٹھکانا کہیں باقی نہیں رہیگا۔ گورنمنٹ کے اِن چند معتوب مسلمانوں نے سرسید احمد خان مرحوم کی گذشتہ چالیس برس کی کوششوں پر پانی پھیر دیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ قضا و قدر کو یہی منظور ہے کہ بقیہ اسلامی دنیا کے ساتھ ہندوستان کے مسلمان بھی برباد ہو جائیں وہ ناواقف مسلمانوں کو ایک ایسے مذہب کی تعلیم دے رہے ہیں جسکی کوئی اصلیت نہیں ہے اور جس پر عمل کرنے سے انکا برباد ہو جانا لازمی ہے۔

مولوی آزاد صاحب یہ کہتے ہیں کہ سلطنت نے جو ہم کو مذہبی آزادی ہر ایک قسم کی دی ہے وہ ہمارے کسی کام کی نہیں ہے۔ ہمکو نمازیں پڑھنے دیا جائے۔ حج کرنے دیا جائے۔ تمام فرائض مذہبی کمال آزادی سے ادا کرنے دئے جائیں ہماری مساجد محفوظ ہوں۔ ہم کو اشاعتِ اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے خواہ کتنی ہی آزادی کیوں نہ دی جائے۔ مذہب کی آڑ میں جسقدر ہم زباندرازی کرنا اور ملک میں شورش مچانا چاہیں اسکے واسطے بھی ہم سے خواہ کوئی پرسش نہ کیجائے اس سب پر ہم کبھی رضامند اور قانع نہ ہوں گے جب تک خلیفۂ اسلام کو اس کی سلطنت واپس نہ دی جائے۔ لیکن مولوی صاحب کو ابھی خلافتِ اسلام کا مذہبی وجود ثابت کرنا باقی ہے۔ اور پھر یہ بتانا کہ یہ مطلوبہ واپسی سلطنت کس کے ہاتھ میں ہے۔ آیا صرف برطانیہ کے یا بقیہ یورپ اور امریکہ کا بھی اس میں دخل ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ تمام باتوں میں سے جو ایک بات مولوی صاحب اور ان کے چند ہمخیال دوستوں کو بھول گئی ہے وہ یہ ہے کہ سلطنتوں کے بننے اور بگڑنے۔ حکومتوں کے ملنے اور کھوئے جانے۔ اقوامِ دنیا کے عزت یا ذلت پانے میں خدا کا بھی کوئی دخل ہے یا نہیں۔ اِن کوائف کے متعلق خدا کا کوئی قانون ہے یا نہیں۔ وہ اب تک یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا یہ فرمان وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ یہود سے ہی تعلق رکھتا ہے اور اسکا اطلاق مسلمانوں پر کبھی نہیں ہوسکتا۔ گویا قرآن کریم میں یہودیوں کے حالات اور واقعات خدا نے محض مسلمانوں کی ضیافتِ طبع کے واسطے بیان کئے تھے اور ان سے یہ مقصود نہیں تھا کہ مسلمان ان سے عبرت اور سبق حاصل

کریں۔ یہ ہادیانِ دین خود ہدایت کے محتاج ہیں اور اِن کو آیت تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ پر مزید غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اب ہم مولوی آزاد صاحب سے رخصت لیتے ہیں کیونکہ دیباچہ بہت لمبا ہو گیا ہے۔ ان کے رسالہ کے مضامین کے متعلق اس سے زیادہ کچھ لکھنے کے واسطے کوئی اور صورت پیدا کرینگے۔ بعض اور باتیں جو اس دیباچہ میں لکھنا چاہتا تھا ان کو چھوڑ دیتا ہوں کیونکہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جو چٹھی میں نے مسٹر گاندھی کو ان کے راولپنڈی تشریف لانے کے موقع پر لکھی تھی وہ اپنے رسالہ کے خاتمہ پر چھاپ دوں۔ ناظرین اس میں بعض قابل مطالع باتیں پائیں گے۔

مسٹر گاندھی نے میری چٹھی کا کوئی تحریری جواب نہیں دیا۔ سنا ہے کہ ان کے ایک رفیق نے جلسہ راولپنڈی میں فرمایا کہ اگر سر سید احمد خان مرحوم زندہ ہوتے تو ان کو ان کے مضامین کا جواب دیا جاتا۔ اور مسٹر گاندھی نے خود ایک دوسرے موقع پر یہ فرمایا کہ وہ خود خلافت کے مسئلہ سے بالکل بے خبر ہیں۔ البتہ مسٹر شوکت علی پر وہ اعتبار رکھتے ہیں اور اس مضمون کو شورش کے واسطے ایک موزون موضوع خیال کرتے ہیں۔ حقیقت میں شورش مسٹر گاندھی کی طبیعت ثانی بنگئی ہے اور انگریزی گورنمنٹ کو مارنے کے واسطے تو کوئی سی لاٹھی ان کے نزدیک بہت اچھی ہے۔

مجھے صرف اتنا ذکر کرنا باقی ہے کہ علاوہ سرسید کے مضامین کے جو طبع اول میں چھاپے گئے تھے موجودہ رسالہ میں جناب مولانا شمس العلما مولوی شبلی نعمانی مرحوم کا ایک مضمون جو ان کے مسودات میں ناتمام پایا گیا ہے اور علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۷ جولائی ۱۹۲۰ء میں چھاپا گیا ہے اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مضمون کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ مولانا شبلی مرحوم کی رائے میں یہ حدیث کہ "خلافت صرف قریش کا حق ہے" صحیح ہے۔ اور ترکوں کے استحقاقِ خلافت کو وہ تسلیم نہیں کرتے۔ مولوی آزاد صاحب نے اس حدیث کی صحت سے انکار کیا ہے۔ کیونکہ ترکی خلافت کے ثبوت میں وہ سدِ راہ ہے۔ ہم مولوی آزاد صاحب کی رائے کو غلط نہیں کہتے اور مولانا شبلی مرحوم

کے مضمون کے چھاپنے سے صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مسئلہ خلافت کے متعلق مسلمان علما کی راؤں میں اختلاف ہے۔ اور یہ اختلافات سرسید مرحوم کی رائے کے صحیح ہونے کی ایک دلیل مہیا کرتے ہیں۔ خداوند کریم مسلمانوں کو توفیق دے کہ سرسید کے اجتہاد کو وہ نظرِ انصاف اور تحقیق سے دیکھیں اور ایک اہم مسئلہ کے فیصلہ میں جس پر اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے نفع و نقصان کا بہت بڑا مدار ہے نفسانیت اور اغراضِ ذاتی کو دخل دیں ؛

راولپنڈی — ۲۹۔ اگست ۱۹۲۰ء

خاکسار — سراج الدین احمد
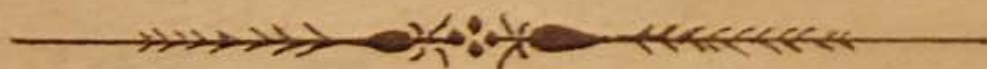
سرسیدؒ کے مضامین خلافت پر

خلافت اور خلیفہ

خلافت کے معنے جانشین ہونے کے ہیں۔ اور خلیفہ اُس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کا جانشین ہو۔ مگر اب خلافت ایک مذہبی لفظ ہو گیا ہے۔ اور خلیفہ بھی ایک مذہبی عہدہ خیال کیا جاتا ہے۔ ابتدا اسکی رومن کیتھلک مذہب سے ہوئی۔ سب سے بڑا افسر سینٹ پیٹر چرچ کا حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے حواری سینٹ پیٹرز کا جانشین سمجھا جاتا ہے جس کو پوپ کہتے ہیں۔

رومن کیتھلک اعتقاد میں پوپ معصوم ہے یعنی اس سے کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ رومن کیتھلک کا یہ اعتقاد ہے کہ پوپ کو دین و دنیا اور نجات آخرت تینوں باتوں کے اختیارات حاصل ہیں۔ اور ہر ایک پوپ کو یہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس زمانہ میں بھی جو ہولی پوپ ہے اس کو بھی یہ اختیارات حاصل ہیں۔

دُنیوی امور میں تو اختیار ہونا ایک ظاہری امر ہے۔ دینی اختیار ہونے سے یہ مراد ہے کہ جو حکم وہ دینی امور میں صادر کرے وہی مانا جائے۔ خواہ وہ پہلے احکام دینی کے موافق ہو یا برخلاف۔ اور گو کہ اس نے ناجائز امر کو جائز یا جائز امر کو ناجائز عموماً کر دیا ہو۔ یا کسی شخص کے لئے کر دیا ہو۔ نجاتِ آخرت سے یہ مراد ہے کہ اُسکو لوگوں کے گناہ معاف کر دینے کا جبکہ وہ پوپ کے سامنے اپنے گناہ بیان کریں اور معافی چاہیں بالکل اختیار ہے۔ اور جب پوپ ان گناہوں کو معاف کرے تو وہ شخص ویسا ہی پاک و صاف ہو جاتا ہے کَمَنْ لَاذَنْبَ لَہٗ اور آخرت میں ان گناہوں کی بابت اس سے کچھ مواخذہ نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی پوپ کو اختیار ہے کہ مرے ہوئے لوگوں کو گناہوں سے نجات دے اور بہشت میں داخل کرے۔ اسی لئے پوپ کی ٹوپی لمبی اور گول ہوتی ہے۔ اسکی چوٹی پر صلیب کی صورت بنی ہوتی ہے اور ٹوپی کے گرد تین تاج ہوتے ہیں۔ پہلے تاج سے دُنیوی اختیار مراد ہے۔ اور دوسرے تاج سے دینی اختیار اور تیسرے تاج سے آخرت کا اختیار۔

مسلمانوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکرؓ آنحضرتؐ کے

جانشین قرار پائے اور ان کو خلیفہ رسول اللہ کا لقب بھی ملا۔ مگر وہ ایسے خلیفہ نہیں تھے جیسا کہ رومن کیتھلک اپنے پوپوں کو سمجھتے ہیں۔ یعنی انکو دینی اختیارات کچھ نہیں تھے نہ وہ حلال کو حرام کر سکتے تھے اور نہ حرام کو حلال۔ صرف انکا کام یہ تھا کہ جو دینی احکام رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ہیں اونکی تعمیل اور تعلیم کی کوشش کریں۔ اور مسلمانوں کے گروہ کی جو ضروریات ہیں انکو پورا کریں۔ اور مطلق انکو اختیار نہ تھا کہ کسی دینی حکم کو منسوخ کریں یا کوئی نیا حکم دین میں جاری کریں۔ اور آخرت کا اختیار انکو مطلق نہیں تھا۔ نہ وہ کسی کے گناہ معاف کر سکتے تھے۔ اور نہ کسی کو بخشوا سکتے تھے۔

ہولی پوپ جو دینی حکم دیتا تھا اس میں کسی کو چون وچرا کرنے کی مجال نہ تھی۔ مگر اسلام میں جن کو خلیفہ کہا جاتا ہے انکے احکام دینی میں ہر شخص کو حق تھا کہ اگر وہ خدا اور رسولؐ کے حکموں کے برخلاف ہوں تو ان کو نہ مانیں اور اسپر حجت کریں۔ غرضیکہ جن کو مذہب اسلام میں خلیفہ کہا جاتا ہے انکو خلافت فی النبوۃ یعنی مذہبی احکام کے وضع کرنے کا حق حاصل نہیں تھا بلکہ وہ صرف خلیفۃ النبی تھے جس سے یہ مراد ہے کہ رسولخدا صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام کو قائم رکھیں اور مسلمانوں کے حالات کی اصلاح کریں۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رض کو خلیفہ رسولؐ کہا گیا ہے مگر حضرت عمر رض کے زمانہ سے یہ لفظ متروک ہو گیا اور بجائے اسکے امیر المؤمنین کا لقب اختیار کیا گیا جو بالکل صحیح اور نہایت موزون اور واقع کے مطابق تھا

حضرت علی مرتضیٰ رض کے زمانہ تک اور اُنکے بعد بھی جبتک رہ بجائے خلیفہ کے امیر المؤمنین کا لفظ زیادہ تر استعمال ہوتا تھا۔ مگر ان کے بعد اور امام حسن علیہ السلام کے زمانہ کے بعد جن لوگوں نے اقتدار حاصل کیا اُنہوں نے اس خیال سے کہ خلیفہ کا لفظ امیر المؤمنین کے لفظ سے زیادہ مقدس ہے اپنے تئیں خلیفہ کے لفظ سے تعبیر کیا۔ جیسے کہ خلفائے بنی اُمیہ اور بنی عباس نے اپنے نام کے ساتھ خلیفہ کا لفظ بھی شامل کر لیا تھا۔ مگر یہ امر غور طلب ہے کہ خلیفہ یا امیر المؤمنین کا ہونا قریش کی نسل کے لوگوں پر منحصر ہے یا نہیں۔

اس باب میں مختلف روایتیں ہیں۔ مستدرک میں اور اُسکی دوسری کتاب میں جو کنیتوں کے بیان میں ہے۔ حضرت انس رض سے ایک روایت لکھی ہے۔ اسمیں ہے۔ اَلْاُمَرَاءُ مِنْ قُرَیْشٍ۔ اور مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں حضرت علی مرتضیٰ رض کی روایت ہے

لکھا ہے اَلاَئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْشِ ۔ مسند امام احمد حنبل اور بخاری اور صحیح مسلم میں ابن عمر سے جو روایت ہے اس میں لکھا ہے لایزال ھذا الامر فی قریش اور معجم طبرانی اور مسند امام احمد حنبل میں ذی مجمر کی روایت میں ہے کان ھذا الامر فی حمیر فنزعہ اللہ منھم وجعلہ فی قریش اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہذا الامر سے قوم کی سرداری یا حکومت مراد ہے۔ کیونکہ حمیر کی قوم سے خلافت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو کسی طرح متصور ہو نہیں سکتی۔ پس صاف ظاہر ہے کہ ہذا الامر سے قوم کی سرداری اور حکومت مراد ہے۔ نہ خلافت مصطلحہ۔

اور مسند امام حنبل اور مسند ابی یعلی اور صحیح ابن حبان اور جامع ترمذی میں سفینہ سے روایت ہے الخلافۃ بعدی فی امتی ثلاثون سنۃ ثم ملک بعد ذالک۔

سنن ابوداؤد اور مستدرک حاکم میں سفینہ سے ہی روایت ہے۔ خلافۃ النبوۃ ثلاثون سنۃ ثم یؤتی اللہ الملک من یشاء۔ اور معجم طبرانی اور شعب الایمان بیہقی۔ اور کتاب المعرفۃ ابونعیم میں معاذ اور ابوعبیدہ بن الجراح سے روایت ہے کہ ان ھذا الامر بدا رحمۃ ونبوۃ ثم یکون رحمۃ وخلافۃ ثم کائن ملک کان عضوضا ثم کائن عتوا وجبیرۃ وفسادا فی الارض۔

یہ تمام روایتیں جو ہم نے بیان کیں "منتخب کنز العمال فی سنن الافعال والاقوال" میں مندرج ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ تمام روایتیں مجروح و مقدوح ہیں۔ اور لائق اعتبار نہیں مگر ہم اس آرٹیکل میں اس امر پر بحث نہیں کرتے بلکہ انہی روایتوں کو قابل قبول تسلیم کر کے کہتے ہیں کہ ہر گاہ خلافت کا اختتام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تیس برس بعد مذکور ہو چکا ہے۔ اور وہ تیس برس خلع خلافت حضرت امام حسن علیہ السلام پر ختم ہوتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ انکے بعد جو لوگ صاحب حکومت وسلطنت ہوئے ہم انکو خلیفہ رسول اللہ یا خلیفہ مصطلحہ قرار دیں۔ خواہ وہ قرشی ہوں خواہ غیر قرشی۔

پس خلافت کا زمانہ ختم ہونیکے بعد جو لوگ صاحب حکومت ہوئے وہ لوگ بادشاہ یا سلطان یا والی ملک یا امیر وغیرہ قرار پا سکتے ہیں۔ اور جو مذہبی تعلق ہم مسلمانوں کو ان خلفاء سے تھا۔ جو زمانہ تیس برس بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوئے وہ ان حاکموں سے نہیں ہو سکتا۔ جو بعد تیس برس مذکور کے ہوئے۔ خواہ وہ اپنا نام خلیفہ رکھیں

یا سلطان یا امیر یا جو کچھ چاہیں۔ پس کسی مسلمان حاکم کو جو کسی ملک میں حکومت رکھتا ہو۔ بجز ایک مسلمان حاکم کے اور کچھ نہیں خیال کر سکتے۔ نہ اسکو خلیفہ رسول اللہ یا خلیفہ خلیفہ رسول اللہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ ہاں بیشک اسلامی اتحاد اسکے ساتھ رکھتے ہیں۔ اسکی بھلائی وبہتری سے خوش اور اسکی برائی و ذلت سے غمگین ہوتے ہیں۔ سلطان ٹرکی کی اس فتح سے جو اسوقت یونانیوں پر حاصل ہوئی ہے بہ سبب اس اتحاد قومی کے جو اسلام نے مسلمانوں میں قائم کیا ہے۔ مسلمان نہایت خوش ہیں اور خدا کا شکر کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ترکوں کی شکست ہوتی تو ہمکو اسی اتحاد کے سبب ضرور رنج ہوتا۔ اور یہ ایک امر انسان کا طبعی ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔

یونانی ہمارے حاکم نہیں ہیں۔ ہم انکی رعیت نہیں ہیں۔ پس ہمکو یہ کہنے میں کہ خوب ہوا یونانیوں نے شکست پائی اور ذلیل ہوئے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ ترکوں نے فتحیابی کیا تامل ہے۔

ہمکو ہرگز معلوم نہیں ہے کہ گورنمنٹ انگریزی کی جسکے امن میں بطور رعیت ہم مسلمان رہتے ہیں اس لڑائی میں جو ترکوں اور یونانیوں سے ہوئی کیا پالیسی ہے۔ اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انگلش گورنمنٹ کی پالیسی ترکوں کے خلاف ہے ہمکو اس پر یقین نہیں۔ اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ لوگ وہ بات کہتے ہیں کہ ان کو درحقیقت معلوم نہیں۔ اور اگر بالفرض انگلش گورنمنٹ کی پالیسی ترکوں کے برخلاف بھی ہو تب بھی از روئے مذہب کے جو ہمارا فرض اپنے حاکموں کی اطاعت اور فرمانبرداری کا ہے اس سے ہم کسی طرح بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اور ایسی حالت میں بھی ہمارا فرض ہے کہ اپنی گورنمنٹ کے مطیع۔ فرمانبردار اور وفادار رہیں۔ بہت سے بہت اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہ ہے کہ خدا سے دعا کیا کریں کہ برٹش گورنمنٹ اور مسلمانوں کی سلطنتوں میں خواہ وہ ٹرکی کی ہو یا ایران یا افغانستان کی یا اور کسی دور دراز ملک کی دوستی اور ارتباط رہے اور کبھی مخالفت پیدا نہ ہو۔

یونانی اور ترک

یونانیوں پر ٹرکی کی فتح کی خوشی میں مسلمانوں نے حد اعتدال سے باہر قدم رکھا ہے۔ ترکوں کی اس فتح کو اسلام کی فتح پکارتے ہیں۔ ہماری دانست میں ایسے امور میں اسلام کو شامل کرنا اور اسلام! اسلام!! پکارنا نہایت

ناسمجھی کی بات ہے۔ اسلام کی فتح آج نہیں ہوئی بلکہ اُس دن ہوئی جبکہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم
نے ہزاروں کافروں اور مشرکوں اور بت پرستوں میں کھڑے ہو کر فرمایا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ
کافر کہتے ہی رہے اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۔ یعنے
کیا اس نے بہت سے خداؤں کے بدلے ایک ہی خدا ٹھیرایا ہے یہ تو ایک عجیب بات ہے
مگر رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ خدا نے بھی یہی کہا کہ
اَنِ اعْبُدُوْنِیْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۔ یعنی میری ہی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے
پس کسی مسلمان بادشاہ کی فتحیابی کو اسلام کی فتح پکارنا اسلام کی قدر و منزلت
کو نہ سمجھنا ہے۔ فتح و شکست خدا کی دین ہے جس کو چاہے دے۔ خود خدا فرماتا ہے
وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ یعنی ہم ان دنوں کو لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے
ہیں۔ کبھی مسلمانوں کی غیر مذہب والوں پر فتح ہوتی ہے۔ کبھی غیر مذہب والوں کی مسلمانوں
پر۔ جبکہ ترکوں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی مدد سے روسیوں پر فتح پائی تو ہم اس فتح
کو کس نام سے پکاریں۔ اور جب ترکوں کی روسیوں سے شکست ہوئی تو کیا ہم اس
شکست کو اسلام کی شکست سے (نعوذ باللہ) موسوم کریں۔ حاشا و کلّا۔ ہمارا مقصد
یہ ہے کہ ایسی چیزوں کے ساتھ جو دنیاوی امور اور دنیا اسباب پر منحصر ہیں کبھی ادھر ہوتے
ہیں کبھی اُدھر۔ اسلام کے معزز نام کو جس نے اصلی فتح پائی ہے اور جو ہمیشہ فتحمند رہے گا
شامل کرنا کمال ناسمجھی کی بات ہے۔ ہم کو خوش ہونا چاہئے کہ ایک مسلمان سلطنت اس جنگ
میں فتحیاب ہوئی اور برباد نہیں ہوئی۔ لیکن اسکو ایک اسلامی لباس پہنانا اور اسلام کی
فتح اسلام کی فتح پکارنا اگر حد سے باہر قدم رکھنا نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اور یہ فتح
ایسی کونسی فتح ہے جس پر اتنا شور و غل مچایا جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ترکوں کے
آگے یونانیوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ اگر وہ مقابلہ کرینگے تو جس طرح ایک باز چڑیا مار لیتا ہے
اسی طرح ترک یونانیوں کو مار لیں گے۔ اندیشہ اگر تھا تو یہ تھا کہ یونانیوں کو ترکوں سے
مقابلہ کرنے کی جرأت کیوں ہوئی۔ اور اس لئے خیال کیا جاتا تھا کہ در پردہ کوئی بڑی قوی
سلطنت یونانیوں کی مدد پر ہے۔ اس شبہ کو مسٹر گلیڈسٹون کی نامعقول سپیچوں اور
تحریروں   لنڈن کے ریڈیکل مجنونوں کی اسپیچوں اور ٹیلیگراموں نے زیادہ قوی
کر دیا تھا۔ مگر ہر سمجھدار سمجھ سکتا تھا کہ نہ مسٹر گلیڈسٹون گورنمنٹ پر ہیں اور نہ قلیل ریڈیکل

ممبران پارلیمنٹ کا گورنمنٹ پر کچھ اثر پڑ سکتا ہے۔ پس یہ خیال کر لینا کہ گورنمنٹ انگریزی کی پالیسی ترکوں کے برخلاف ہے نہایت غلطی اور سفاہت پر مبنی تھی۔ جب لڑائی کا معرکہ گرم ہوا تو کسی بڑی سلطنت نے یونانیوں کا ساتھ نہیں دیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ نہ گورنمنٹ انگریزی یونانیوں کی مددگار تھی نہ فرانس نہ جرمن نہ کوئی اور گورنمنٹ۔ اب آیندہ جو کچھ ہو سکی بنا پولیٹیکل مصلحتوں پر ہوگی نہ اسلام کی مخالفت پر۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو جو اس معاملہ اِسقدر جوش و خروش ہوا ہماری دانست میں صرف انگریزی اخبار اسکا باعث ہوئے ہیں مسٹر گلیڈسٹون نے اور انگریزی اخباروں نے کوئی درجہ اہانت اور سخت کلامی کا مسلمانوں کی نسبت نہیں چھوڑا تھا۔ اور کوئی بدی اور بُرائی ایسی نہ تھی جو اُنھوں نے ترکوں کی نسبت نہ لگائی ہو۔ اور یہ سب باتیں خاصکر ترکوں اور عام طور پر سب مسلمانوں کو رنج دِہ اور سخت رنج دِہ تھیں۔ مگر جب ترکوں کی فتح ہوئی تو اُنھوں نے اپنے دشمنوں کے ساتھ ایسا رحم برتا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا مثلاً جب یونانیوں کے ایک گروہ کے پاس کھانے کو کچھ نہیں رہا تو ترکوں نے اپنے پاس سے اُنکو کھانے کو دیا۔ یونانیوں کے مجروحوں کی تیمارداری کی اور نہایت مہربانی سے اُنکے ساتھ برتاؤ کیا اب ترکوں کی فتح ہونے کے بعد اس رنج کے مقابلہ میں مسلمانانِ ہند نے اس فتح کی خوشی میں حدِ اعتدال سے زیادہ خوشی ظاہر کی۔ اور گورنمنٹ انگریزی ان سب باتوں کو نہایت خاموشی سے دیکھتی رہی۔ ہم بھی اس خوشی کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے۔ مگر یہ بتلاتے ہیں کہ ہم مسلمانانِ ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کی رعایا ہیں۔ اور اسبات کو کبھی بھولنا نہیں چاہیئے کہ ہم غیر سلطنتوں کے ساتھ پولیٹیکل امور میں کوئی کام اور کوئی فعل ایسا نہیں کر سکتے جو گورنمنٹ کے خلاف ہو پس ہمکو لازم ہے کہ ہم وہی کریں جو گورنمنٹ کی مرضی کے برخلاف نہ ہو۔

ترکوں کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمدردی

اگر کوئی شخص ہمارے دوست کی جان بچائے۔ یا مصیبت کے وقت اسکے ساتھ ہمدردی کرے تو ہم کو اسکا شکر کرنا لازم ہے یا نہیں؟

سب سے بڑا سخت وقت ترکوں پر وہ تھا جبکہ ۱۸۵۵ء میں روس نے ترکوں سے لڑائی شروع کی جو جنگ کریمیا کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت دو سلطنتیں۔ یعنے انگلستان اور فرانس نے ترکوں کے ساتھ ہمدردی کی۔ اور فوج سے۔ روپیہ سے ترکوں

کی مدد کی۔ اور کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اگر انگلستان اور فرانس اس زمانہ میں ترکوں کی مدد نہ کرتے تو سلطنت ترکی کا یقینی خاتمہ ہو جاتا۔ پس اب سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکوں کے ساتھ ہمدردی ہے تو کریمیا جنگ کے فتح ہونے کے بعد کس وجہ سے مسلمانوں نے گورنمنٹ انگریزی اور گورنمنٹ فرانس کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اور انکے لئے مساجد و معابد میں کیوں نہیں دعا کی۔ اور کیوں پیغام تار برقی شکریہ کے یا ایڈریس شکر گذاری کے انگلش اور فرنچ گورنمنٹ کے پاس نہیں بھیجے۔

ایک انگریز کا قول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بڑے احسان فراموش ہیں کہ جس زمانہ میں انگریزوں نے جان و مال سے ترکوں کی مدد کی تھی اسی کے قریب یعنی ۱۸۵۷ء میں انہوں نے ہندوستان میں انگریزوں کے مقابلہ میں غدر کیا۔ اگر درحقیقت ان کو ترکوں کے ساتھ ہمدردی ہوتی تو اس سے بہت بڑے احسان کو جو انگریزوں نے ترکوں کے ساتھ کیا تھا ہرگز فراموش نہ کرتے۔ اور انگریزوں کی حکومت کے مقابلہ میں بغاوت نہ کرتے۔

ہم تو اس قول کو تسلیم نہیں کرتے۔ اسلئے کہ ہمارے نزدیک ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے ساتھ کسی کے دل میں بغاوت کرنیکا ارادہ نہیں تھا۔ بلکہ بقول ایک بڑے مورخ مسٹر"کے"۔ کے وہ بغاوت نہیں تھی صرف ایک"سپاہی وار" تھی۔ اور جو فسادات کہ اس زمانے میں ہوئے وہ بد عملی ہو جانے کے سبب سے ہوئے۔ نہ اس وجہ سے کہ رعایا کو انگریزوں کے مقابلہ میں بغاوت کرنی مقصود تھی۔ مگر ہاں اسکا کچھ جواب نہیں ہے کہ اسوقت کیوں ہندوستان کے مسلمانوں نے گورنمنٹ انگلستان اور گورنمنٹ فرانس کا شکریہ ادا نہ کیا۔

۱۸۷۶ء میں دوبارہ ترکوں اور روسیوں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ جسمیں عثمان پاشا غازی کی بہادری کے کارنامے ہندوستان کی ہر ایک گلی اور کوچہ میں مشہور تھے مگر بدبختی سے ترکوں کو شکست ہوئی۔

اور ۱۸۷۸ء میں روسی پلیونا اور درہ شپکہ کو فتح کرتے ہوئے قسطنطنیہ کی دیواروں تک جا پہونچے۔ اس وقت ترکوں کی سلطنت کے نیست و نابود ہو جانے میں کچھ

باقی نہیں رہتا تھا۔ مگر گورنمنٹ انگریزی انکی حمایت میں اُٹھی اور اپنے جنگی جہاز قسطنطنیہ کے سمندر میں بھیجدئے۔ اور روس سے کہا کہ بس آگے قدم نہ بڑہائیں۔ اور صرف انگلستان کے بیچ پڑنے سے برلن کا عہدنامہ تحریر ہوا۔ اور سلطنت ٹرکی جیسی اس زمانہ میں ہے باقی رہی۔ اگر انگلستان ترکوں کی مددنہ کرتا تو ترکوں کی سلطنت کا باقی رہنا محال تھا۔

پس اب سوال یہ ہے کہ ایسی ہمدردی جو انگلستان کی طرف سے ترکوں کی نسبت ظاہر ہوئی ہندوستان کے مسلمانوں نے اسکا کیوں شکریہ ادا نہیں کیا۔

ادھم پاشا نے یونانیوں کی حال کی لڑائی میں اس سے زیادہ بہادری اور دلاوری نہیں دکھائی جسقدر کہ عثمان پاشا نے پلونا میں دکھائی تھی۔ پس کس وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں نے ادھم پاشا کا بہت شکر کیا اور عثمان پاشا کی نسبت کچھ نہیں کیا۔ ہمارے پاس اسکا جواب کچھ نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک جو کچھ اسوقت مسلمانوں نے کیا وہ صرف انکی ایک خفیف الحرکتی تھی۔ اور ایک کے دیکھا دیکھی اوروں نے بھی وہی کیا جو انھوں نے کیا تھا۔

جو لوگ اسبات کا خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے جو یونان کی فتح پر اسقدر خوشی منائی وہ کسی پولٹیکل امر پر مبنی تھی ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے اور بجز خفیف الحرکتی کے اور کوئی امر نہیں ہے۔ سلطان کو خلیفہ ماننا اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے جسطرح کہ بنی امیہ اور بنی عباس کو خلیفہ کہا جاتا ہے۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو سلطان ٹرکی کے احکام مثل احکام پوپ کے واجب التعمیل سمجھتا ہو۔ یا مثل احکام خلفاے راشدین رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین کے جانتا ہو۔ پس کسی طرح پر خیال نہیں ہو سکتا کہ ان کا خوشی منانا اور مبارکباد کے تار بھیجنا کسی پولٹیکل امر پر مبنی ہو۔ گو کہ ہمارے نزدیک ان کا ایسا کرنا بھی بلا اجازت گورنمنٹ کے جس کے کہ وہ رعیت ہیں ہرگز مناسب نہیں۔

اس وقت سلطان نے تھسلی کو اپنی سلطنت میں شامل کرلینے کو تمام یورپ کی سلطنتوں کی رائے کو نہیں مانا۔ ہم بھی نہیں چاہتے کہ سلطان تھسلی سے اپنا قبضہ اٹھالے۔ مگر معلوم نہیں کہ اس انکار کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور کونسی سلطنتیں سلطان کی دوست اور کونسی سلطنتیں اسکی مخالف ہو جائینگی یا کوئی متوسط امر سب سلطنتوں کی صلاح سے قرار پاویگا۔ لیکن یہ باتیں پولٹیکل معاملات سے

علاقہ رکھتی ہیں ان کو مذہبی لباس پہنانا ہمارے نزدیک بالکل ناواجب ہے۔
کیونکہ ہر ایک سلطنت اپنی پولیٹیکل مصلحت کو قائم رکھنا چاہتی ہے۔ خواہ وہ مصلحت ترکوں کے مقابلہ میں ہو۔ خواہ روس۔ جرمنی اور اٹلی کے مقابلہ میں۔ اور کبھی کوئی سلطنت اپنی پولیٹیکل مصلحت کو فروگذاشت نہیں کرتی۔ ہاں جو سلطنتیں کہ ضعیف ہیں انکی پولیٹیکل مصلحت یہی ہوتی ہے کہ جو سلطنت قوی ہے اسکی رائے کو تسلیم کریں۔ کیونکہ اس میں وہ اپنی بھلائی تصور کرتی ہے۔ اور قوی سلطنت سے مقابلہ کرنا نہیں چاہتی۔ اس زمانہ میں تمام معرکہ آرائیاں اس بنا پر ہوتی ہیں نہ کسی مذہبی بنا پر۔

خلافت

رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں تین صفتیں جمع تھیں :-
اول۔ نبوت۔ یعنی شریعت کے احکام کا خدا کیطرف سے آپ کے پاس پہونچنا۔
دوم۔ اُن احکام کی لوگوں میں تبلیغ۔
سوم۔ ملکی سیاست اور نفاذ احکام اور محافظت احکام شریعت کی قوت اور اہل ملک کی حفاظت اور قوت اور طاقت سے مخالفین کی مدافعت۔

پہلا امر رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر ختم ہو گیا۔ اور اس امر میں کوئی شخص رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ اور نائب نہ تھا اور نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

دوسرے امر میں تمام فقہا اور علما اور محدثین جو احکامِ شریعت محمدیہ علے صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی لوگوں میں تبلیغ کرتے ہیں۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ یا نائب متصور ہو سکتے ہیں۔ اور اسی واسطے بعض مفسرین نے آیت :-
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ
میں جو لفظ اولی الامر کا ہے اس میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام اور علما اور فقہا کو داخل کیا ہے۔

تیسرے امر میں وہ لوگ جو کسی ملک کو اپنے قبضہ میں رکھتے ہیں اور اسکی سیاست کے

مختار ہیں اور نفاذ احکام اور محافظت احکام شریعت کی قوت اور اہل ملک کی حفاظت اور قوت اور طاقت سے مخالفین کی مدافعت کر سکتے ہوں - وہ لوگ اس امر میں خلیفہ یا نائب رسولؐ متصور ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ خود صفات اور اخلاق محمدیؐ سے موصوف اور تمام احکام شرعی کے پابند ہوں اور تقدس ظاہری اور باطنی ان کو حاصل ہو۔ اور بعض مفسرین نے سرداران لشکر اسلام کو بھی اولی الامر میں شامل کیا ہے جنکے ماتحت بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔

سلاطین اسلام جو کسی ملک پر سلطنت رکھتے ہیں ممکن ہے کہ تیسرے امر کے لحاظ سے اپنے تئیں خلیفہ کے لقب سے ملقب کریں۔ مگر انکی خلافت یا سلطنت اسی ملک پر اور اسی ملک کے مسلمان باشندوں پر محدود رہیگی جو ان کے قبضۂ اقتدار میں ہے نہ اس ملک کے مسلمان باشندوں پر جو ان کے قبضۂ حکومت میں نہیں ہیں۔ اسلئے کہ خلیفہ کو ضرور لازم ہے کہ وہ ملک پر قبضہ اور سلطنت رکھتا ہو اور احکام حدود و قصاص اس میں جاری کر سکتا ہو۔ اسکا حکم اس میں جاری ہو۔ دین کی حمایت کرتا ہو۔ دشمنوں کے ہاتھ سے اس ملک کو اور اس ملک کے باشندوں کو محفوظ رکھ سکتا ہو۔ اور اس ملک میں امن قائم رکھنے کی قوت اسکو حاصل ہو۔ پس جس ملک میں کسی مسلمان بادشاہ کو ایسا اختیار اور اقتدار نہ ہو وہ اس ملک کے لیے یا اس ملک کے مسلمان باشندوں کے لئے خلیفہ نہیں ہو سکتا - نہ خلیفہ کہلایا جا سکتا ہے۔

سلطان ٹرکی کے خلیفہ ہونے کی نسبت جو اس پر بحث کی جاتی ہے کہ وہ نسل قریش سے نہیں ہے۔ اور جو لوگ ان کو خلیفہ جانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ وہ روایت جسمیں خلیفہ کے قریشی النسل ہونے کا ذکر ہے صحیح نہیں ہے۔ ہم ان تمام بحثوں سے قطع نظر کرتے ہیں اور سلطان کو خلیفہ تسلیم کرنیکے بعد کہتے ہیں کہ اگر وہ خلیفہ ہیں تو اس ملک کے اور اس ملک کے مسلمان باشندوں کے خلیفہ ہو سکتے ہیں جن میں انکی حکومت ہے اور جس میں ان کو قتل و قصاص اور احکام دین کے قائم رکھنے کا اختیار و اقتدار حاصل ہے۔ نہ اس ملک کے جہاں ان کو مطلق اختیار و اقتدار حاصل نہیں ہے - نہ وہ قتل و قصاص کے احکام کو جاری کر سکتے ہیں نہ دین کو قائم رکھ سکتے ہیں نہ وہاں کے مسلمانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ایسے ملک میں وہ شرط نہیں پائی جاتی جو خلیفہ ہونیکے لئے ضرور ہے۔ اور اس لئے وہ اس

ملک کے اور اس ملک کے مسلمان باشندوں کے لئے خلیفہ نہیں ہو سکتے۔

ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے گورنمنٹ انگریزی کی رعیت ہیں۔ اور گورنمنٹ انگریزی میں مستامن ہو کر رہتے ہیں۔ گورنمنٹ انگریزی نے ہم کو امن دیا ہے ہر طرح پر ہم کو مذہبی آزادی بخشی ہے۔ باوجودیکہ گورنمنٹ انگریزی عیسائی مذہب رکھتی ہے مگر کوئی عیسائی مسلمان ہو جائے تو وہ اسی طرح مزاحمت نہیں کرتی جس طرح کہ کسی مسلمان کے عیسائی ہو جانے سے نہیں کرتی۔ مشنری پادریوں کو گورنمنٹ سے کچھ تعلق نہیں ہے جسطرح کہ وہ وعظ کرتے پھرتے ہیں اسیطرح سینکڑوں مسلمان مذہب اسلام کا وعظ کہتے پھرتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان عیسائی ہو جاتا ہے تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی عیسائی بھی مسلمان ہو جاتا ہے۔

پس گورنمنٹ انگریزی نے ہم مسلمانوں کو جو بطور رعیت کے مستامن ہو کر اس کی عملداری میں رہتے ہیں کافی طور پر مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ علاوہ اس کے گورنمنٹ انگریزی میں ہماری جان و مال کی حفاظت ہوتی ہے۔ ہمارے تمام حقوق جو نکاح۔ طلاق وراثت۔ وصیت۔ ہبہ۔ وقف سے متعلق ہیں بموجب شرع اسلام کے ہمکو ملتے ہیں گو کہ اس قسم کے مقدمات ایک عیسائی حاکم کے سامنے پیش ہوں۔ کیونکہ عیسائی حاکم مجبور ہے کہ ان کو بموجب شرع اسلام کے فیصل کرے۔ اور اسلئے ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم گورنمنٹ انگریزی کے خیرخواہ اور وفادار رہیں اور کوئی بات قولاً و فعلاً ایسی نہ کریں جو گورنمنٹ انگریزی کی خیرخواہی و وفاداری کے برخلاف نہ ہو۔

سلطان عبدالحمید خان خلد اللہ ملکہ کی ہم رعیت نہیں ہیں۔ نہ ان کو ہم پر یا ہمارے ملک پر کسی قسم کا اقتدار حاصل ہے۔ پس وہ بلاشبہ ایک مسلمان بادشاہ ہیں اور بوجہ اتحاد اسلامی کے ہم ان کی بھلائی سے خوش اور برائی سے ناخوش ہوتے ہیں۔ مگر کسیطرح نہ شرعاً نہ مذہباً ہم پر نہ خلیفہ ہیں نہ خلیفہ ہو سکتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی حق خلافت ہے تو وہ اسی ملک پر اور اسی ملک کے مسلمانوں پر محدود ہے جو انکی عملداری میں رہتے ہیں۔

تاریخ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جن مسلمان بادشاہوں نے لقب خلیفہ کا اختیار کیا۔ ان کی خلافت اسی ملک اور اسی ملک کے باشندوں پر محدود رہی ہے جو ان کی سلطنت میں شامل ہو اور ان کے قبضۂ اقتدار میں داخل تھے۔ اور جو ملک ان کی سلطنت میں نہ تھے ان کی خلافت یا امامت یا سلطنت سے ان کو کچھ تعلق نہ تھا۔ چنانچہ اس مقام پر ہم تاریخ

طور سے خلفاء کے سلسلہ کو بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ ان کی خلافت اسی حدتک محدود تھی جسقدر ملک کہ ان کے قبضہ میں تھا۔

حضرت ابوبکرؓ جو بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہوئے بلاشبہ وہ پسند فرماتے تھے کہ خلیفۂ رسول کہلائیں۔ مگر جب حضرت عمرؓ ان کے جانشین ہوئے تو یہ بات پسندیدہ نہ تھی کہ حضرت عمرؓ خلیفہ رسول اللہ کہلائیں۔ اسلئے بجائے اس لقب کے امیر المؤمنین کا لقب اختیار کیا گیا جسکے معنے ہیں مسلمانوں کا سردار۔ یہی لقب حضرت عمرؓ کا اور حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کا اور حضرت امام حسن علیہ السلام کا رہا۔

جب حضرت امام حسنؓ نے خلع خلافت کی اور معاویہ ابن سفیان کے ہاتھ حکومت آئی۔ اور سنہ ۴۱ھ مطابق سنہ ۶۶۱ء کے دمشق دار الخلافہ ٹھیرا۔ اس وقت ان کا لقب بھی امیر المومنین رہا۔ اور آجتک امیر معاویۃؓ کے لقب سے مشہور ہیں۔ مگر چونکہ خلیفہ کا لقب زیادہ مقدس سمجھا جاتا تھا کہ اس میں اشارہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کا نکلتا تھا اس لئے وقتاً فوقتاً جو کوئی بنی امیہ میں سے جانشین ہوا اس نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا جو درحقیقت بمعنے سلطان کے تھا۔

اس کے بعد بنی عباس نے بنی امیہ کو مغلوب کیا اور سنہ ۱۳۲ھ مطابق سنہ ۷۵۰ء کے السفاح نے حکومت حاصل کی اور المنصور نے بجائے دمشق کے بغداد کو دار الخلافہ بنایا۔ اور جو لوگ وقتاً فوقتاً بنی عباس میں سے جانشین ہوتے گئے سب نے اپنا لقب خلیفہ کا اختیار کیا خلفائے بنی امیہ معدوم ہوگئے اور خلفائے بنی عباس کا دور دورہ ہوگیا۔

المقتدر باللہ عباسی بغداد میں خلیفہ موجود تھا۔ اسی کے عہد میں ایک خلافت افریقہ میں قائم ہوگئی۔ یعنی سنہ ۲۹۷ھ مطابق سنہ ۹۰۹ء کے عبداللہ المہدی نے افریقہ میں بمقام قیروان خلافت کی بنیاد ڈالی۔ اور سنہ ۳۴۱ھ مطابق سنہ ۹۵۲ء کے المعز باللہ نے قیروان سے مصر کو دار الخلافہ ٹھیرایا۔ عبداللہ المہدی اور اسکے جانشین سب علوی تھے اور سب نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ اب اسلامی دنیا میں دو خلیفہ مستقل با اختیار و اقتدار پیدا ہوگئے۔ ایک خلفائے بنی عباس بغداد میں دوسرے خلفائے علوئین قیروان یا مصر میں۔

سنہ ۱۳۸ھ مطابق سنہ ۷۵۵ء کے عبدالرحمن الداخل اندلس میں داخل ہوا۔ چندروز تک

تو اسکے جانشینوں نے خلیفہ کا لقب اختیار نہیں کیا۔ مگر جب المقتدر باللہ کے زمانہ میں جو بغداد میں خلیفہ تھا۔ یعنی سنہ ۳۰۰ھ مطابق سنہ ۹۱۲ء کے عبدالرحمن ناصر تخت پر بیٹھا۔ اس نے اور اسکے بعد جو جانشین ہوئے انھوں نے لقب خلیفہ کا اختیار کیا۔ جن کا دارالخلافہ قرطبہ تھا۔

اب اسلامی دنیا میں تین خلیفہ مستقل اور با اقتدار و اختیار پیدا ہو گئے۔ ایک خلفاے بنی عباس بغداد میں اور خلفائے علویین مصر میں اور عبدالرحمن ناصر اور اسکے جانشین اندلس میں۔ یہ تینوں خلیفہ اپنے تئیں اسی ملک کا خلیفہ سمجھتے تھے جو ان کے قبضہ اقتدار میں تھے۔ ہر ایک خلیفہ کے دربار میں قاضی اور مفتی سب موجود تھے اور اپنے اپنے ملک کے خلیفہ کے حکم اور مرضی سے فقہ کے احکام جاری کرتے تھے۔ بغداد کی عباسی خلافت میں عدالتیں فقہ حنفی پر عملدرآمد کرتی تھیں۔ مصر کی فاطمی حکومت میں فقہ اسمٰعیلی کا رواج تھا۔ اور اندلس کے اموی خاندان کی عدالتوں میں فقہ مالکی جاری تھا اور وہ ہر ایک کی خلافت کو اس ملک میں جو اسکی سلطنت میں تھا جائز قرار دیتے تھے۔ پس ان تمام حالات سے ظاہر ہے کہ سلطان عبدالحمید خان خلد اللہ ملکہ نہ ہم مسلمانوں کے لئے جو رعایائے گورنمنٹ انگریزی ہیں خلیفہ ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ سلطان ترکی حافظ حرمین شریفین ہیں بلکہ حافظ احرام شریفہ ہیں جن میں کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اور بیت المقدس یعنی یورشلم جو مقام مقدس یہودیوں۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کا ہے داخل ہیں۔ مگر اس سے اور خلیفہ ہونے سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام یا خلیفہ ہر زمانہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک ہی ہونا لازم ہے اور اسلئے سلطان ترکی کو وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا خلیفہ قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ محض غلط رائے ہے۔ کیونکہ اس بات کا ثبوت کہ تمام دنیا میں ایک امام یا خلیفہ ہو نہ قرآن مجید سے ہوتا ہے نہ کسی حدیث سے۔ کوئی شخص آج تک نہ ایسا ہوا ہے اور شاید ہو گا بھی نہیں جسکی حکومت و سلطنت تمام دنیا پر ہو۔ مسلمان دنیا کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں اور جب ایسے ملکوں میں ہوں جنمیں کسی مسلمان بادشاہ کی حکومت و سلطنت نہیں ہے تو وہاں نہ کوئی مسلمان ان مسلمانوں پر جو وہاں رہتے ہیں خلیفہ ہو سکتا ہے نہ امام زمان جس کو مرادف خلیفہ تصور کیا ہے۔

اور یہ رائے تاریخ کے بھی برخلاف ہے۔ کیونکہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ ایک وقت میں تین خلیفہ گذرے ہیں جن کو ان ملکوں کے رہنے والے مسلمان علما و قاضی و مفتی جو ان کی حکومت میں رہتے تھے خلیفہ برحق قرار دیتے تھے۔

ہاں مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت کے قریب جب حضرت عیسےٰ آسمان سے اُترینگے اور حضرت امام مہدی پیدا یا ظاہر ہوں گے تو حضرت امام مہدی تمام دنیا کے امام ہوں گے۔ اسوقت جو زندہ رہیگا وہ دیکھیگا کہ کیا ہوتا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک نہ حضرت عیسےٰ آسمان پر سے اُترنیوالے ہیں نہ مہدی موعود پیدا یا ظاہر ہونیوالے ہیں۔ کیونکہ جتنی روایتیں اس باب میں ہیں وہ ثابت نہیں ہیں اور اکثر ان میں کی موضوع ہیں۔

بعض روایتوں پر استدلال کیا جاتا ہے کہ ہر مسلمان کو امام زمان کا جاننا اور اس سے بیعت کرنا واجب ہے۔ گو یہ روایتیں بھی قابل وثوق اور لائق اعتبار نہیں ہیں مگر ہم ان پر کچھ بحث کرنا نہیں چاہتے۔ اور ان کے تسلیم کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ہر ایک شخص کو اپنے خلیفہ کا جسکی سلطنت میں وہ رہتا ہے جاننا اور اس سے بیعت کرنا ضرور ہے بیعت کا مطلب صرف اسبات کا اقرار کرنا ہے کہ ہم اسکے مطیع اور تابعدار ہیں اور جو شخص جسکی حکومت میں رہتا ہو اسکا فرض ہے کہ اسکی تابعداری کرے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو لوگ اسکی حکومت میں نہیں رہتے وہ بھی اسکی تابعداری کا اقرار کریں۔ غرضیکہ کوئی مسلمان بادشاہ ان مسلمانوں کے لئے جو اسکی سلطنت میں نہیں رہتے خلیفہ نہیں ہو سکتا۔

امام اور امامت

اس مقام پر امام کے لفظ سے ہماری مراد اس شخص سے نہیں ہے جو سب کے آگے کھڑا ہو کر لوگوں کو نماز پڑھاتا ہے۔ بلکہ ایسے شخص سے مراد ہے جو بہ سبب کمال نفسی و روحانی یا علمی و عملی کے امام کے لفظ سے مخاطب کیا جاتا ہے۔

رسولخدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں علاوہ نبوت اور نفاذ احکام اور محافظت مسلمین کے جو آنحضرتؐ کے بعد شان خلافت سے متعلق ہیں۔ ذاتی کمالات و اعلیٰ درجہ کی صفات بھی تھیں پس ان صفات کمال میں مشابہت پیدا کرنا اس کمال میں امامت کے درجہ پر پہنچنا ہے۔ مثلاً رسولخدا صلے اللہ علیہ وسلم کو علم دین میں محققاً بذریعہ وحی یا الہام کے جو

مقتضائے فطرت نبوت تھا اعلیٰ درجہ کا کمال حاصل تھا۔ اور گو اس درجہ کا کمال کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ مگر جن لوگوں نے علم دین اور احکام شریعت کے سمجھنے اور نکالنے میں نہ بطور تقلید بلکہ بطور اجتہاد کوشش کی اور اسکو حاصل کیا اور جم غفیر مسلمانوں نے اس کو قبول و تسلیم کیا۔ گو کہ اس میں خطا کا احتمال بھی ہو۔ اُنہوں نے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے کمال دینی میں ایک قسم کی مشابہت پیدا کی۔ اور اس کمال میں درجۂ امامت حاصل کیا اور تمام لوگوں نے اس فن میں ان کو تسلیم کیا جیسے کہ مجتہدین اربعہ۔ امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ۔ امام احمد حنبلؒ امام مالکؒ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین تھے۔

مثلاً جو تقدس ذاتی اور صفات روحانی اور علم دینی و روحانی رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا اسکو آئمہ اہلبیت علیہ السلام نے حاصل کیا خواہ تعلیماً خواہ وِجداً اور اس کمال میں رسولخدا صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشابہت پیدا کی اس لئے جم غفیر مسلمانوں نے ان کو اس کمال میں امام تسلیم کیا اور آئمہ اہلبیت سے ملقب ہوئے۔

پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو علم عقائد تحقیقاً یا از روے وحی یا الہام کے حاصل تھا جو دوسرے کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ پس اس میں مشابہت کا حاصل کرنا صرف استدلال پر منحصر تھا۔ پھر جس نے استدلال سے اس کو حاصل کیا گو کہ اس میں غلطی کا بھی احتمال ہو اور جم غفیر مسلمانوں نے اسکو تسلیم کیا۔ اس نے اس فن میں امام کا درجہ پایا جیسا کہ امام غزالیؒ اور امام فخر الدین رازیؒ و دیگر علمائے علم کلام اس فن میں درجۂ امامت کو پہونچے۔

علاوہ اس کے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم میں بہت سے کمالات ذاتی تھے جیسے کہ تقدس روحانی۔ استغراق فی ذات اللہ۔ توجہ الی اللہ۔ تعمیل حکم ربانی۔ حلم۔ رحمت۔ شفقت علی المسلمین وغیرہ وغیرہ۔ پس جو شخص کمالات مصطفوی کے کسی کمال سے اپنے تئیں متشابہ کرتا ہے وہی اس کمال کا امام ہوتا ہے خواہ وہ امام کے نام سے مشہور رہا ہو یا نہیں۔

اور جس شخص نے تمام روحانی اور اخلاقی صفات محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں مشابہت پیدا کی ہو اور ملک بھی اسکی حکومت میں ہو جس میں اسکو احکام شرعی کے نفاذ اور مسلمانوں کی ہدایت اور حفاظت کا اختیار حاصل ہو بلا شبہ وہ شخص بھی اس

ملک کے لئے جو اسکی حکومت میں ہے خلیفہ رسول اللہ اور امام کے لقب سے ملقب ہونے کا مستحق ہے۔ اور اگر اس نے اپنے تئیں ان صفات کمال کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تھیں مشابہ نہیں کیا اور کسی ملک کی حکومت حاصل کی جیسا کہ بنی امیہ و بنی عباس نے تو وہ درحقیقت اس ملک کے لئے اور اس ملک کے مسلمان رہنے والوں کے لئے سلطان ہے نہ امام۔ اور نہ خلیفہ رسول اللہ۔ گو کہ اس نے فخریہ طور پر خلیفہ کا لقب اختیار کیا ہو اور بزورِ حکومت اپنے تئیں خلیفہ کہلوایا ہو۔ اسی لئے اس نے اپنے اجتہاد سے جو احکام متعلق مذہب کے دئے ہوں وہ وقعت سے نہیں دیکھے جاتے۔

اور اگر اس نے اپنے تئیں صفات کمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ کیا ہے اور کوئی ملک اسکی حکومت اور قبضۂ اقتدار میں نہیں ہے جس میں وہ احکام شرعی کو نافذ اور وہاں کے مسلمانوں کی حفاظت کر سکے تو وہ صرف انہی امور میں جن میں اس نے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے مشابہت پیدا کی ہے امام ہے۔ مگر اسپر خلیفہ رسول اللہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور اسی وجہ سے آئمۂ اہلبیت علیہم السلام امام کے لقب سے ملقب ہوئے ہیں۔

مگر فرقِ اسلامیہ میں امام کا مرتبہ قرار دینے میں اختلاف ہے۔ شیعہ تو امام کو معصوم اور منصوب من اللہ اور مفروض الطاعت قرار دیتے ہیں۔ اور یہ کرامت حضرت امام مہدی علیہ السلام پر جو آئمۂ اہلبیت کے اخیر امام ہیں ختم ہو گئی۔ وہ پیدا ہوئے تھے اور سرمن رائے کی غار میں غائب ہو گئے ہیں مگر اب تک زندہ ہیں اور امام العہد والزمان ہیں اور قیامت کے قریب ظاہر ہوں گے۔ اور اسلئے کوئی دوسرا شخص امام نہیں ہو سکتا۔

مگر اہلسنت وجماعت کسی امام کو منصوب من اللہ اور معصوم عن الخطا قرار نہیں دیتے۔ بلکہ وہ سوائے پیغمبر کے کسی کو گو کہ وہ کیسا ہی مقدس۔ ذی علم اور صاحب فضل وکمال ہو معصوم عن الخطا نہیں سمجھتے۔

نتیجہ اس اختلاف کا یہ ہے کہ شیعہ تو امام کے حکم تمام دنیا کے شیعہ مسلمانوں پر جو وجوباً واجب التعمیل سمجھتے ہیں مگر چونکہ اُن کے امام دنیا کی آنکھوں سے غائب ہیں اسلئے اس زمانہ میں کوئی ایسا حکم ان کے لئے وجود پذیر نہیں ہو سکتا جس کی اطاعت تمام دنیا کے شیعہ مسلمانوں پر واجب ہو۔

اہل سنت وجماعت کسی امام موجودہ یا گذشتہ کا حکم تمام دنیا کے سنی مسلمانوں پر بے چون وچرا واجب التعمیل نہیں سمجھتے۔ جو لوگ بے پڑھے یا کم استعداد ہیں وہ تو جس امام کے معتقد ہیں یا جنکے ان کے باپ دادا معتقد تھے اسی کی پیروی کرتے ہیں۔ اور جو لوگ ذی استعداد اور قابل ہیں وہ جب تک اس بات کو نہ سمجھ لیں کہ وہ حکم امام کا صحیح اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق ہے اس کو واجب التعمیل نہیں جانتے اور اس سبب سے اہل سنت وجماعت میں تقلید اور عدم تقلید امام معین پر بحث چلی آتی ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ قرون مشہود لھا بالخیر میں اور اُسکے بعد تک بھی یعنی جب تک فقہ کی کتابیں مرتب ہوئیں کوئی شخص کسی کی تقلید پر مجبور نہیں تھا۔ اگر کوئی مسئلہ کسی کو معلوم نہیں تھا تو وہ کسی عالم سے جس سے اسکا جی چاہتا تھا پوچھ لیتا تھا۔

غرضیکہ سُنیوں میں بعد پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے کوئی شخص ایسا نہیں ہو سکتا کہ مذہبی امور میں اسکا حکم تمام دنیا کے مسلمانوں پر واجب التسلیم ہو۔ خود صحابہ متعدد مسائل مذہبی میں مختلف الرائے تھے اور ایک دوسرے کی رائے کو واجب التسلیم نہیں سمجھتا تھا مثلاً اکثر صحابہ معراج جسمانی کے قائل تھے۔ مگر حضرت عائشہ رض کو معراج جسمانی سے انکار تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رض سماع موتے کے قائل تھے۔ مگر بعض صحابہ اس کے سخت مخالف تھے۔ حضرت ابوہریرہ رض کا عقیدہ تھا کہ عزیزوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب نازل ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ رض اسکے مخالف تھیں۔ یہ اختلاف صحابہ میں عقائد کا تھا۔ اسی طرح وہ فقہی مسائل میں بھی باہم مختلف تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رض اس بات کے قائل تھے کہ وضو میں اعضا کو ایک ایک بار دھونا چاہئے۔ مگر حضرت ابوہریرہ رض کے نزدیک دو دو بار دھونا لازم تھا حضرت علی رض اور حضرت ابن عباس رض اور حضرت ابوہریرہ رض تو فجر کی نماز میں دعا قنوت پڑھنے کو لازمی قرار دیتے تھے۔ مگر حضرت ابومالک اشجعی کو اس سے انکار تھا۔ اکثر صحابہ مسح علی الخفین کو جائز سمجھتے تھے مگر حضرت عائشہ رض اور حضرت ابن عباس رض اس کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اسیطرح اور بہت سے مسائل ہیں جن میں صحابہ اور تابعین آپسمیں مختلف الرائے تھے اور ایک دوسرے کی رائے کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔

موجودہ زمانہ کی حالت پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس اُمت میں کوئی

ایسا شخص موجود نہیں ہے جو امام کا رتبہ رکھتا ہو اور نہ کوئی شخص گو کہ وہ کسی ملک کا حاکم بھی ہو ایسا ہے جو خلیفہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کہلانے کا مستحق ہو۔ البتہ جو مسلمان کسی ملک پر حکومت رکھتے ہیں وہ اس ملک کا سلطان کہلانے کے مستحق ہیں۔ اور درحقیقت وہ اس ملک کے سلطان بھی ہیں۔ گو انہوں نے اپنے تئیں کسی لقب سے ملقب کیا ہو۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مذہب اسلام کے رو سے رعیت کو اپنے سلطان کے ساتھ کسطرح پیش آنا لازم ہے۔ اسکا بیان مشکوٰۃ کی ایک حدیث میں ہے جسکو ہم بعینہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال ان السلطان ظل اللہ فی الارض یأوی الیہ کل مظلوم من عبادہ فاذا عدل کان لہ الاجر و علی الرعیۃ الشکر فاذا جار کان علیہ الاصر و علی الرعیۃ الصبر۔

یعنی ابن عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا نقل کیا ہے کہ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے کہ ہر مظلوم اس کے بندوں میں سے اسکی پناہ میں آتا ہے۔ پھر اگر اس نے عدل کیا تو اسکی بھلائی اسکے لیے ہے اور رعیت پر اسکا شکر کرنا فرض ہے اور اگر وہ ظلم کرے تو اسکی برائی اسپر ہے اور رعیت کو اس پر صبر کرنا لازم ہے۔

اس حدیث میں سلطان کا لفظ بغیر کسی قید کے آیا ہے۔ پس وہ سلطان خواہ مسلمان ہو خواہ یہودی ہو خواہ عیسائی ہو خواہ آتش پرست ہو خواہ بت پرست اس کے ساتھ اسکی رعیت کو اسی طرح پیش آنا لازم ہے کہ جسطرح سے اس حدیث شریف میں بیان ہوا ہے۔

اس حدیث میں سلطان کو ظل اللہ اس لئے کہا ہے کہ جسطرح ہر مظلوم خدا کی پناہ ڈھونڈھتا ہے اسی طرح اسکی رعیت کا ہر مظلوم کسی مذہب کا ہو سلطان کی پناہ میں آتا ہے اور اسی مشابہت سے سلطان کو ظل اللہ کہا ہے۔

اب ہم کو ہندوستان کے مسلمانوں پر غور کرنی ہے جو بطور رعیت کے اور مستأمن ہو کر انگلش گورنمنٹ کے ماتحت رہتے ہیں۔ انگلش گورنمنٹ نے ان کے ساتھ عدل و انصاف کرنے میں بقدر اپنی طاقت کے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا کہ

تمام معاملات کے فیصلہ کے لئے قانون بنا دئے ہیں اور ہر شخص پہلے سے جانتا ہے کہ کسی فعل کا نتیجہ وہ ہے جو قانون میں لکھا ہے۔

مذہبی آزادی انگلش گورنمنٹ نے ہر ایک قوم کو دی ہے۔ تمام مذہب والوں کے مذہبی معاملات ان کے مذہبی مسائل کے موافق عدالت سے فیصل ہوتے ہیں۔ جان اور مال کا امن اور سوائے بغاوت اور شرارت کے ہر قسم کی آزادی انگلش گورنمنٹ کی رعیت کو حاصل ہے۔ پس بالتخصیص مسلمانوں کو مطابق اس حدیث کے جو اوپر مذکور ہوئی انگلش گورنمنٹ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور انگلش گورنمنٹ کی رعایا ہو کر وہ انگلش گورنمنٹ کے ساتھ کسی قسم کا فساد یا مخالفت یا بغاوت قولاً و فعلاً نہیں کر سکتے۔

اور حدیث کی کتابوں میں متعدد حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو نہایت تاکید سے نصیحت کی ہے اور فرمایا ہے کہ تم اپنے امیروں اور حاکموں کی ہر حالت میں اطاعت کرو۔ خواہ تمہارے ساتھ ظلم و ستم ہوتا ہو یا وہ انصاف اور مروت سے پیش آتے ہوں۔ ان حدیثوں میں حاکم یا امیر کے ساتھ کوئی شرط یا قید نہیں جس سے یہ بات معلوم ہو کہ حاکم یا امیر کس مذہب کا ہو۔ پس تمام مسلمانوں کو ان حدیثوں کا ماننا اور اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ اور انہی حدیثوں کے رو سے لازم آتا ہے کہ تمام مسلمان جو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے سایہ حکومت میں زندگی بسر کرتے ہیں نہایت وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کریں۔ اور خدا کا شکر کریں کہ اس نے ایسی مہربان اور عادل گورنمنٹ ان کی جان و مال اور عزت اور مذہب پر مسلط کی ہے جو ان کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کرتی ہے اور اس نے ہر طرح کی مذہبی آزادی عنایت کی ہے۔ اور وہ کوئی ایسا حکم نہیں دیتی ہے نہ کبھی دے گی جس سے ہم کو خدا کی نافرمانی کرنی پڑے۔ اور اس قول پر عمل کرنے کی ضرورت پیش آئے کہ لا سمع ولا طاعۃ فی معصیۃ اللہ۔

خطبہ میں بادشاہ کا نام

چند روز ہوئے کہ ہم نے پایونیر میں نسبت خطبہ جمعہ کے ایک تحریر دیکھی تھی جس میں بعض خطبوں کا ترجمہ بھی تھا۔ جمعہ کا خطبہ ہو یا عیدین کا مسلمانوں کے مذہب کے بموجب اس میں صرف خدا کی تعریف اور مسلمانوں کو نیکی اختیار کرنے کی نصیحت ہونی چاہئے۔ خطبہ کی

کوئی عبارت مذہبًا معیّن نہیں ہے ۔ بلکہ خطیب خود اپنے علم و استعداد لیاقت کے موافق خطبہ پڑھتا ہے ۔ یا اَور لوگوں نے جو خطبے کہے ہیں اور جو چھپے ہوئے یا قلمی لوگوں کے پاس ہوتے ہیں ان میں سے کوئی خطبہ پڑھ دیتا ہے ۔ خطبہ کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے عیسائیوں میں سرمن ۔ مگر پایونیر میں اس بات کی کافی بحث نہیں کی گئی تھی کہ آیا خطبہ میں بادشاہ کا نام لینا بھی کوئی مذہبی مسئلہ ہے ۔ اور مذہب کے رو سے جائز ہے یا نہیں اور اسی بحث کو ہم اپنے اس آرٹیکل میں لکھنا چاہتے ہیں ۔

پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں اور خلفائے راشدین کے وقت میں کسیکا نام خطبہ میں نہیں پڑھا جاتا تھا ۔ مگر جو محاربات کہ صحابہ میں واقع ہوئے تھے اور اس کے سبب سے باہمی نزاع قائم ہوگئی تھی ۔ اور خلفائے راشدین کی نسبت سب و شتم کا رواج ہو چلا تھا ۔ اسکے مٹانے کو خطبہ میں خلفائے راشدین اور عمّین مکرمین کا نام لیئے جانیکا رواج ہوا تاکہ معلوم ہو کہ سب کے سب واجب التعظیم اور قابل ادب ہیں ۔ اور فقہار نے اس کو مندوب یعنی اچھا قرار دیا ۔ اس کے بعد بخوبی تحقیق نہیں ہوتا کہ کس خلیفہ سے جو حقیقت میں بادشاہ تھے ان کا نام خطبہ میں لینا شروع ہوا ۔ تاریخ الخلفار سیوطی سے اسکے لقب کے جس میں فخریہ الفاظ تھے خطبہ میں لیا گیا ۔ اور امیر المؤمنین کا لقب تحریرات میں لکھا گیا ۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ :-

وقال علی بن محمد النوفلی وغیرہ لم یدع للسفاح ولا للمنصور ولا للمھدی ولا للھادی ولا للرشید علی المنابر باوصافھم ولا کتب فی کتبھم حتی ولی الامین فدعی لہ بالامیر علی المنابر وکتب عنہ من عبد اللہ محمد الامین امیر المومنین وکذا قال العسکری فی الاوائل اول من دعی لہ بلقبہ علی المنابر الامین ط ۔	علی بن محمد نوفلی نے اور اسکے سوا اَور لوگوں نے کہا ہے کہ سفاح اور منصور اور مہدی اور ہادی اور رشید کے لئے منبروں پر اور اسکی تعریفیں کر کے دعا نہیں کی گئی اور نہ اُنکے فرمانوں میں کچھ فخریہ لفظ لکھے گئے مگر جبکہ امین خلیفہ ہوا تو اسکے لئے منبر پر امیر کہکر دعا کی گئی اور اسکی طرف سے فرمانوں پر لکھا گیا ۔ " عبد اللہ الامین امیر المومنین " اور عسکری نے بھی اوائل میں لکھا ہے کہ سب سے اول امین کے لئے منبروں پر اس کا لقب لے کر دعا کی گئی ۔

مگر اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ فقہا کی (جنکی رائے واجتہاد پر مذہب اسلام کا مدار رہ گیا ہے) کیا رائے ہے۔ درمختار میں جو نہایت معتبر فقہ حنفی کی کتابوں میں سے ہے لکھا ہے کہ خطبہ میں بادشاہ کے لئے دعا کرنا کوئی مذہبی ثواب کا کام نہیں ہے۔ صرف قہستانی نے لکھا ہے کہ بادشاہ کا نام لینا کچھ مضائقہ نہیں۔ اور بحر الرائق میں ہے کہ بادشاہ کا نام لینا ثواب نہیں ہے اسلئے کہ یہ امر محدث یعنی بدعت ہے۔ خطبہ میں صرف نصیحت ہونی چاہئے۔

چنانچہ درمختار اور اُسکے حاشیہ میں لکھا ہے کہ :۔

و مندب ذکر الخلفاء الراشدین و العمین لا الدعاء للسلطان وجوزہ القہستانی کذا فی الدر المختار۔ قولہ وجوزہ القہستانی الخ عبارتہ تنویدعو للسلطان الزمان بالعدل والاحسان منتجیا فی مدحہ عما قالوا انہ کفر وخسران کما فی الترغیب وغیرہ الخ واشار الشارح بقولہ وجوز الی حمل قولہ تنوید عو الخ علی الجواز لا الندب لانہ حکم شرعی لابد لہ من دلیل وقد قال فی البحر انہ لایستحب لما روی عن عطاء حین سئل عن ذلک فقال انہ محدث وانما کانت الخطبۃ تذکیرا کذا فی رد المحتار حاشیۃ الدر المختار

ثواب ہے ذکر کرنا خلفائے اربعہ راشدین اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دونوں چچا حضرت حمزہ اور حضرت عباس کا اور ثواب نہیں ہے بادشاہ وقت کے لئے دعا کرنا (واضح ہو کہ ایسی دعا کے ساتھ بادشاہ کا نام بھی لیا جاتا ہے) مگر قہستانی نے اسکو جائز لکھا ہے۔ یہ مضمون تو درالمختار میں ہے اور درمختار کے حاشیہ میں جسکا نام ردالمحتار ہے یہ لکھا ہے کہ قہستانی کی یہ عبارت ہے کہ خلفائے اربعہ اور عمین مکرمین کے نام کے بعد بادشاہ وقت کے لئے دعا کی جاسے۔ کہ وہ عدل اور بھلائی کرے مگر اسکی ایسی تعریف کرنے سے پرہیز کیا جائے جسکو عالموں نے کفر و گمراہی کہا ہے۔ چنانچہ یہ مطلب ترغیب میں اور اور کتابوں میں لکھا ہے۔ درمختار کے مصنف نے جو لفظ جائز قہستانی کی طرف منسوب کیا ہے اور ثواب ہوئے کو منسوب نہیں کیا اس کا سبب یہ ہے کہ ثواب افعال میں ایک حکم شرعی ہے جسکے لئے کسی دلیل شرعی کا ہونا ضرور ہے (اور بادشاہ کے نام لینے اور اُسکے لئے دعا کرنے کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں) اور بحرالرائق میں مذکور ہے کہ بہتر نہیں ہے بادشاہ کا نام لینا اور اُسکے لئے دعا کرنا۔ کیونکہ عطا ابن یسار تابعی سے روایت ہے کہ جب ان سے اسکی نسبت پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ یہ نئی بات

نکالی ہوئی ہے۔ خطبہ میں تو صرف نصیحت ہوا کرتی تھی۔

اس تمام تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ خطبہ میں بادشاہ کا نام لینا اور اسکے لئے دعا کرنا کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ مذہب کی رو سے بدعت و محدث ہے۔ وللہ درّ مَنْ قَالَ کل محدث (ای فی الدین) بدعة وکل بدعة ضلالة۔

جس طرح کہ خلفائے بغداد اپنے فخر و شیخی کے لئے خطبوں میں اپنا نام لواتے تھے اسیطرح ہندوستان کے بادشاہ بھی اپنا نام خطبوں میں لواتے تھے مگر مذہب کے بالکل برخلاف تھا۔ ہم نے بھی اکبر شاہ و بہادر شاہ کا نام باوجودیکہ کچھ بھی بادشاہت ان کی باقی نہیں رہی تھی دہلی کی مسجدوں کے خطبوں میں اور بہیر و نجات کی بھی بہت سی مسجدوں میں لیا جاتا سنا ہے۔ مگر ہندوستان کی بہت سی مسجدیں ایسی بھی تھیں کہ شاہ عالم کے بعد ان میں کسی بادشاہ کا نام نہیں لیا جاتا تھا۔ اسلئے کہ اکبر شاہ و بہادر شاہ کو خطبہ میں بادشاہ کے نام سے ملقب کرنا وہ جھوٹ سمجھتے تھے۔ اور خطبہ میں اسکا استعمال کرنا جھوٹ کا استعمال کرنا جانتے تھے۔

شاہ عالم کے بعد جن مسجدوں میں اکبر شاہ و بہادر شاہ کا نام نہیں لیا جاتا تھا وہ دو قسم کی ہو گئی تھیں۔ جو لوگ کہ اپنی دانائی سے یہ سمجھتے تھے کہ کسی مسلمان بادشاہ کا نام لینا چاہئے گو وہ کہیں کا بادشاہ ہو۔ اُنھوں نے تو سلطانِ روم کا نام لینا شروع کر دیا۔ اور شاید بمبئی کلکتہ اور ایسے ہی دور دراز کے شہروں میں اسکا رواج ہوا۔ مگر اکثر مسجدوں میں کسی بادشاہ کا نام نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ اور باقی مسجدوں میں مسلمانوں کے حق میں صرف یہ دعا ہوتی تھی کہ اَللّٰھُمَّ اَیِّدِ الْمُسْلِمِیْنَ بِالسُّلْطَانِ الْعَادِلِ بعض جگہ سلطان کے لفظ کے بدلے امام کا لفظ کہا جاتا ہے وَالْخَیْرِ وَالطَّاعَةِ وَاِتِّبَاعِ سُنَنِ سَیِّدِ الْمَوْجُوْدَاتِ یعنی اے خدا مسلمانوں کی مدد کر بادشاہ عادل کی حکومت سے اور ان کی مدد کر بھلائی کرنے سے اور خدا کی فرمانبرداری اور رسول کی پیروی کرنے سے جو تمام موجودات کے سردار ہیں۔ یہی دعا ہندوستان کی اکثر مسجدوں میں پڑھی جاتی ہے۔ پس جو بادشاہ ہم پر عدل و انصاف سے حکومت کرے ہمارے مذہبی فرائض میں دست اندازی نہ کرے۔ ہماری جان و مال کی حفاظت کرے۔ ہمارے حقوق ہم کو عطا کرے وہ بھی اس دعا میں داخل ہے۔ یہ دعا درحقیقت کسی بادشاہ کیلئے نہیں ہے بلکہ عام مسلمانوں کی بھلائی کیلئے ہے۔ پس یہ خیال کہ کسی بادشاہ کا خطبہ میں نام لینا کسی مذہبی مسئلہ پر مبنی ہے اور مسلمانوں کو اس بادشاہ کے مذہب کی رو سے کوئی مذہبی اطاعت واجب ہے صحیح نہیں ہے؛

شیخ الاسلام

شیخ الاسلام کا عہدہ سلطنت ٹرکی میں درحقیقت ایک بہت بڑا معزز عہدہ ہے شیخ الاسلام بحیثیت اپنے عہدہ کے اس کونسل خاص کا ممبر بھی ہے جسکا پریزیڈنٹ وزیر اعظم ٹرکی ہوتا ہے اور جسکو مجلس باب العالی کہتے ہیں۔

یہ عہدہ ہمیشہ ایسے شخص کو دیا جاتا ہے جو بہت بڑا عالم اور حنفی مذہب ہو اور مسائل فقہ حنفی سے بخوبی واقفیت رکھتا ہو۔اس کو کوئی ایسا حق یا اختیار نہیں ہے کہ کوئی جدید حکم مثل حکم شرع کے جاری کر سکے یا اُن حکموں میں سے جو شرع میں ہیں کوئی حکم منسوخ یا ترمیم کر سکے بلکہ اسکا کام صرف یہ ہے کہ جو واقعات پیش آئیں انکی نسبت بتادے کہ فقہ حنفی کا حکم کیا ہے یا جن احکام کا اجرا منظور ہو انکی نسبت بتادے کہ فقہ کے مطابق ہیں یا نہیں۔اگرچہ اسکو پہلے تو بہت زیادہ اختیار تھا مگر اب بھی کسیقدر اختیار رکھتا ہے کہ جن احکام کو خلاف شرع سمجھے انکے عدم اجرا میں بحث و کوشش کرے۔

ان اسباب سے شیخ الاسلام کو گویا تمام امور کلی و جزوی سلطنت میں ایک گونہ مداخلت ہو جاتی ہے۔مثلاً جب وزیروں نے سلطان عبدالعزیز یا سلطان مراد کا معزول کرنا مناسب سمجھا تو اس میں شیخ الاسلام کا اتفاق ضرور تھا اور اس سے ایک فتوےٰ لیا گیا کہ سلطان عبدالعزیز یا سلطان مراد لائق بادشاہت نہیں رہا۔اسکا عزل کرنا احکام شریعت کے موافق درست ہے جب دوسرا بادشاہ اسکی جگہ قائم کیا گیا تو شیخ الاسلام سے اسکا استحقاق بادشاہت تسلیم کرانا ہوا۔

چونکہ مسلمانوں نے یہ ٹھہرا رکھا ہے کہ عقائد مذہبی اور معاملات دینوی اور انتظامات ملکی سب کا تقلید آموجب فقہ حنفی کے ہونا چاہیئے (جو نا واجب تقلید اصلی باعث تمام خرابیوں کا ہے جو سلطنت اسلامیہ میں پائی جاتی ہیں) اس سبب سے ہر ایک امر متعلق انتظام سلطنت میں شیخ کو مداخلت ہے۔زمین پر مالگذاری مقرر کرنے۔ٹیکس یا جزیہ لگانے تجارتی احکام جاری کرنے۔ملکی قانون جاری کرنے عدالتوں کے تقرر کرنے۔عدالتوں کی کارروائی کے ضوابط مقرر کرنے۔انفصال حقوق کے اصول میں جنگی معاملات میں غیر سلطنتوں سے صلحنامہ کرنے میں۔فوج کے آراستہ کرنے میں۔یہانتک کہ فوج کی وردی اور ہتھیار اور قواعد کے طریقہ میں بھی اس کو مداخلت ہوتی تھی۔

مسلمانوں کا گو وہ کسی ملک کے ہوں یہ خیال نہیں ہے کہ شیخ الاسلام کی روح میں کوئی ایسی بات ہے جس کا حکم ماننا ضرور ہے جیسے کہ رومن کیتھلک عیسائیوں کا پوپ کی نسبت خیال ہے۔ بلکہ وہ اسکے حکم کو اس خیال سے واجب التعمیل سمجھتے ہیں کہ وہ فقہ حنفی کا سب سے بڑا عالم تسلیم کیا جاتا ہے اور جو وہ حکم دیتا ہے سمجھا جاتا ہے کہ بے شک وہ فقہ و شریعت کے مطابق ہے جس کی پیروی مسلمان مذہباً ضروری سمجھتے ہیں۔

اگلے زمانہ میں جبکہ ترکوں میں جہالت اور ناتہذیبی زیادہ تھی اسوقت تک شیخ الاسلام کو ان تمام باتوں میں پوپ کی مانند بہت بڑا کامل اختیار تھا مگر رفتہ رفتہ بہت سی باتوں میں کم ہوتا گیا۔ اور سلطان محمود کے وقت سے اسکے اختیاروں میں بہت کمی ہو گئی اب تو شیخ الاسلام صرف شیر کی کھال رہ گئے ہیں۔ جو باتیں بطور فتوٰے لوگوں میں مشہور کرنی ہوتی ہیں۔ جیسے حال میں اشتہار جہاد یا اعلام نامہ عدم زیادتی نسبت عیسائیان مشتہر کیا گیا ہے وہ شیخ الاسلام کی معرفت ہوتا ہے۔ عدالتوں میں ابھی اس کی مداخلت ہے گو پہلے کی نسبت کسی قدر کم ہو۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ شیخ الاسلام کا تبدیل کرنا ترکوں کے لئے کچھ آسان کام نہ تھا۔ وہ جھٹ سلطان کے کافر یا عیسائی ہو جانے کا فتوٰے دے دیتا تھا اور لوگوں میں بغاوت پھیلانی شروع کر دیتا تھا۔ مگر دیکھو کہ اب کسقدر زمانہ بدل گیا ہے کہ ہم دوشنبہ کی تار برقی سے پاتے ہیں کہ شیخ الاسلام مثل ایک نوکر کے موقوف کر دیا گیا اور دوسرا شیخ الاسلام اسکی جگہ مقرر ہو گیا۔ ہمارے یورپین ہمعصر مسلمانی مذہب کے اصولوں سے بخوبی واقفیت نہیں رکھتے اسلئے وہ شیخ الاسلام کی نسبت معلوم نہیں کیا خیالات رکھتے ہیں۔ پاینیر لکھتا ہے کہ تھوڑا عرصہ ہوا کہ ہم نے اشتہار جہاد کی نسبت مباحثہ کیا تھا۔ یہ اشتہار اُس شیخ الاسلام نے مشتہر کیا تھا جو اب اس معزز عہدے سے موقوف کیا گیا ہے۔ اور ہم نے بھروسہ کر کے اس امر کا یقین کرایا تھا کہ برٹش انڈیا کے مسلمانوں کے دلوں میں اس فتوے جہاد سے کچھ اثر نہ ہوگا۔ گو ان لوگوں کی ہمدردی ترکوں کے واسطے کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ علی ہذا القیاس شیخ الاسلام کی برطرفی ایک ایسی بات ہے جسکا اثر قسطنطنیہ پر ہو مگر قیصر ہند کی مسلمان رعایا پر شمہ بھر بھی اسکا کچھ اثر نہ ہوگا۔

ہم بیان کرنا چاہتے ہیں کہ شیخ الاسلام مسلمانی مذہب کے مطابق کوئی چیز نہیں ہے۔ کوئی شخص خواہ نخواہ اسکا حکم ماننے پر مجبور نہیں ہے جو شخص اسکا حکم نہ مانے اسکے ایمان میں اسکے مذہب میں کسی قسم کا نقصان نہیں آسکتا۔ نہ کوئی گناہ اس پر ہوتا ہے۔ یہ عہدہ

کوئی مذہبی عہدہ نہیں ہے جیسے کہ پوپ کا عہدہ خیال کیا جاتا ہے۔ ہر شخص کو آزادی ہے کہ شیخ الاسلام کے احکام پر غور کرے۔ اگر اسکے نزدیک وہ حکم غلط ہو اس کو رد کر دے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے نہ کوئی اسکا حکم ان پر واجب التعمیل ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ٹرکی کے مسلمانوں کی حالت سے از روئے احکام مذہب اسلام کے بالکل مختلف ہے۔ ہندوستان کے مسلمان گورنمنٹ انگریزی کے رعایا ہیں۔ اور اس کے امن میں رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے ٹرکی کے مسلمان ایسے نہیں ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے لئے احکام مذہبی مختلف ہیں۔ شیخ الاسلام کا کوئی حکم ہندوستان کے مسلمانوں سے مذہباً متعلق نہیں ہو سکتا ہندوستان کے مسلمانوں کا مذہباً یہ فرض ہے کہ اپنے بادشاہ کی جسکی وہ رعیت ہیں اور جسکے امن میں مذہبی آزادی سے وہ بسر کرتے ہیں ہمیشہ اسکی تابع رہیں گو وہ ترکوں کے ساتھ کیسی ہی ہمدردی رکھتے ہوں۔ اور گو ٹرکی میں اور خود قسطنطنیہ میں کچھ ہی ہوا کرے۔ فرض کرو کہ اگر خود انگلش گورنمنٹ بجائے روس کے ہوتی اور ترکوں کا ملک بہ ظلم چھین لینا چاہتی اور گو اس بات سے کیسا ہی رنج و غم اور غصہ اور آزردگی ہندوستان کے مسلمانوں کو ہوتی اسپر بھی مذہب کی رو سے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان میں جہاں ان کو امن اور مذہبی آزادی ہے بجز انگریزی گورنمنٹ کی اطاعت کے اور کچھ چارہ نہیں۔ پس ہم اپنے یورپین دوستوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ٹرکی میں کچھ ہی انقلاب ہوا کریں اور کچھ ہی احکام جاری ہوا کریں انکا اثر ہندوستان میں مذہب کی رو سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو امور خلاف مراد ٹرکی ہوتے ہیں ان سے ہندوستان کے مسلمانوں کو از حد رنج و غم و غصہ ہوتا ہے۔ مخالفان ٹرکی سے از حد ناراض ہوتے ہیں ہمارے نزدیک یہ بات کہ مسلمان سلطان کو ایک مذہبی پیشوا سمجھتے ہیں اور اس لئے اسکی ہمدردی کرتے ہیں ایک لغو و مہمل بات ہے بلکہ یہ ایک قدرتی ہمدردی اور طبعی بات ہے اور تعلیم سے اور اخبارات سے اور سفر کی آسانی جو اس زمانہ میں حاصل ہے اور جس کے سبب سے سلطنت ٹرکی میں ہندوستان کے مسلمانوں کی آمد و رفت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اس ہمدردی کو بہت کچھ ترقی ہو گئی ہے۔

خلافت

(نوشتہ مولٰنا شبلی نعمانی مرحوم)

منجملہ اُن الفاظ سے جو مسلمانوں میں مذہبی حیثیت سے مستعمل ہیں ایک یہ لفظ بھی ہے لیکن چونکہ یہ لفظ پالیٹکس سے بھی تعلق رکھتا تھا اور پولٹیکل اغراض نے اکثر اُس کے مفہوم اور حقیقت کو بدل کر تعبیر کرنا چاہا اسلیئے بعض اوقات عوام میں اس کے متعلق غلط فہمیاں پھیل گئیں اور کم سے کم یہ کہ اسکے معنے میں ابہام اور اشتباہ آگیا۔ سال دو سال سے زیادہ نہیں گزرے کہ اردو اخبارات میں یہ بحث ایک اتفاقی واقعہ کی وجہ سے چھڑ گئی تھی اور اس نے کسی حد تک طول بھی پکڑ لیا تھا۔ لیکن پھر بعض اسباب سے رُک گئی۔ اس زمانہ میں سر سید مرحوم نے ایک نہایت دلچسپ آرٹیکل لکھا تھا جو علیگڈھ گزٹ میں شائع ہوا تھا۔ میں نے بھی ایک ضمنی موقعہ پر اپنے سفرنامہ میں اس بحث کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسبات کی ضرورت ہے کہ یہ مسئلہ نہایت تحقیق کے ساتھ بالکل صاف کر دیا جائے۔

اِس مسئلہ پر دو حیثیتوں سے بحث ہو سکتی ہے۔

(۱) مذہب کی رُو سے منصب خلافت کی کیا حقیقت ہے۔

(۲) شروع اسلام سے آج تک یہ لفظ کس معنی میں اور کن لوگوں کے لیئے استعمال کیا گیا۔

خلافت یا امامت مترادف الفاظ ہیں۔ اور یہ الفاظ احادیث اور عقائد کی کتابوں میں ایک ہی معنے میں استعمال کیئے جاتے ہیں۔ خلافت یا امامت کی جو تعریف عقائد کی کتابوں میں مذکور ہے وہ یہ ہے۔ ”مسلمانوں پر ایک عام تصرف کا اختیار جس کی اطاعت تمام مسلمانوں پر ضروری ہو“۔ شرح مواقف میں خلافت کی تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے۔ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقامی دین کے قائم رکھنے اور قوم کی حفاظت کرنے میں“۔ شرح مقاصد میں یہ الفاظ ہیں :۔ ”دین اور دنیا کی افسری

بحیثیت قائم مقامی جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم"۔

اس منصب کے حاصل ہونے کے لئے اسلام کے تمام فرقوں کے نزدیک جو شرطیں ہیں ان میں سے ایک بڑی مقدم شرط یہ ہے کہ وہ شخص قریش کے خاندان سے ہو۔ اس شرط سے مسلمانوں کے فقط ایک گروہ نے یعنی معتزلہ نے انکار کیا ہے۔ لیکن یہ گروہ کئی سو برس سے دنیا سے بالکل معدوم ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ آج تمام دنیا کے مسلمانوں کے مذہبی اعتقاد کے مطابق صرف وہ شخص خلیفہ یا امام ہو سکتا ہے جو قریش کے خاندان سے ہو۔ جس بنا پر خلافت کے لئے یہ شرط ضروری سمجھی گئی ہے وہ وہ حدیثیں ہیں جو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مختلف پیرایوں میں نہایت کثرت کے ساتھ منقول ہیں۔ چنانچہ ہم اُن کو اس موقعہ پر تفصیل کے ساتھ نقل کرتے ہیں :۔

حدیث	ترجمہ	ماخذ	
۱۔ الائمۃ من قریش	امام قریش میں سے ہوں گے	مسند امام احمد بن حنبل	
۲۔ الملک فی قریش	حکومت قریش میں رہے گی	ترمذی	صحیح
۳۔ الخلافۃ فی قریش	خلافت قریش میں ہو گی	مسند امام احمد بن حنبل	اسکے راوی ثقہ ہیں
۴۔ یکون اثنا عشر امیرا کلھم من قریش	بارہ امیر ہونگے جو سب کے سب قریش سے ہونگے	صحیح بخاری	صحیح
۵۔ الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ ثم یکون ملکا	خلافت تیس برس رہے گی پھر اسکے بعد سلطنت ہو جاوے گی۔	ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔	ابن حبان نے بھی اسکو صحیح کہا ہے۔ *
۶۔ لایزال ھذا الامر ماضیا ماولاھم اثنا عشر رجلا کلھم من قریش	لوگوں کا کام اسوقت تک ٹھیک رہیگا جب تک بارہ شخص حکمران رہیں گے جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔	صحیح مسلم	صحیح

* دیکھو عینی شرح بخاری جلد اول صہ ۳۲۔

اِن احادیث میں بعض کا تو صریح مطلب یہ ہے کہ "خلافت قریش کا حق ہے"۔ اور بعض میں بظاہر پیشگوئی کے طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ خلافت ہمیشہ قریش میں رہے گی لیکن چونکہ کئی سو برس ہو چکے کہ تمام دنیا میں کوئی حکمران قریش کے خاندان سے نہیں ہے اسلئے اُن احادیث کا یہ مطلب قرار دیا گیا ہے کہ خلافت کا حق درحقیقت صرف قریش کو ہے اور اَور خاندان کے لوگ جو حکمران ہیں وہ بادشاہ ہیں مگر خلیفہ نہیں لیکن جس حدیث میں یہ ذکر ہے

کہ خلافت صرف تیس برس تک رہے گی پھر سلطنت ہو جائے گی۔ اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ تیس برس کے بعد جو زمانروا ہوئے وہ باوجود قریشی ہونے کے خلیفہ نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے۔

بہرحال تمام روایات کا قدر مشترک یہ ہے کہ خلافت کے لئے قریشی ہونا ضروری ہے اور جو شخص قریش کے خاندان سے نہ ہو وہ کسی طرح تمام مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق خلیفہ نہیں ہو سکتا۔

مسلمانوں نے کبھی اور کسی زمانہ میں اس شخص کو خلیفہ نہیں مانا جو قریش کے خاندان سے نہ ہو سب سے اول جس موقعہ پر یہ مسئلہ زیر بحث آیا وہ آنحضرتؐ کی وفات کا دن تھا۔ عین آپ کی وفات کے دن انصار نے یعنی جو لوگ مدینہ کے رہنے والے تھے یہ دعوےٰ کیا کہ خلافت ہمارا حق ہے۔ لیکن جب مہاجرین نے انکے مقابلہ میں یہ استدلال پیش کیا کہ خلافت صرف قریش کا حق ہے تو انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنے دعوےٰ سے دست بردار ہوئے۔ چنانچہ یہ واقعہ نہایت تفصیل کے ساتھ تاریخ طبری۔ ابن اثیر اور ابن خلدون میں مذکور ہے۔ عباسیوں کی سلطنت میں جب ضعف آگیا تو ہر طرف نئے نئے دعویداران حکومت پیدا ہو گئے جن میں سے بعض بعض خاندانوں نے وہ جبروت و اقتدار حاصل کیا اور انکی حدود سلطنت اسقدر وسیع ہو گئیں کہ خود دولت عباسیہ کے زمانہ میں کبھی نہیں ہوئی تھیں تاہم ان میں سے کبھی کسی نے خلافت کا دعوےٰ نہیں کیا اور ہمیشہ عباسی خلیفہ کے آگے (باوجود اسکے کہ وہ دلی کے بہادر شاہ سے زیادہ رتبہ نہیں رکھتے تھے) سر جھکاتے رہے اور اسکی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ خود قریش کے خاندان سے نہ تھے اور اس لئے وہ خلافت کا دعوےٰ کرتے تو مسلمانوں میں سے ایک شخص بھی انکے دعوے کو تسلیم نہ کرتا۔

عضد الدولہ۔ محمود غزنوی۔ ملک شاہ سلجوقی۔ دنیا کے بہت بڑے عظیم الشان شہنشاہ گزرے ہیں لیکن یہ سب کے سب بغداد ہی کے دربار سے لقب اور خطاب حاصل کرتے تھے اور اس پر فخر و ناز کرتے تھے۔ عضد الدولہ جس کو شہنشاہ کا لقب حاصل تھا اور جو بڑا باسطوت و اقتدار بادشاہ گزرا ہے ۳۶۹ھ میں جب بغداد میں طائع اللہ خلیفہ عباسی کے دربار میں لقب لینے کے لئے حاضر ہوا تو سب سے پہلے اس نے زمین چومی۔

پھر پیچھے ہٹ کر دوبارہ زمین چومی۔ اسیطرح سات دفعہ زمین بوسی کی اور جب خلیفہ نے مہربانی سے اس کو زیادہ تقرب کی اجازت دی تو اس نے بڑھ کر خلیفہ کے پاؤں چومے۔ اس وقت خلیفہ نے اُس کو کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا لیکن اس نے بار بار معذرت کی اور جب خلیفہ نے اُسکو مجبور کیا تو "الامر فوق الادب" کے لحاظ سے کرسی کو بوسہ دے کر اُسپر بیٹھ گیا اور کہا کہ "مَیں خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ حضور کی اطاعت مجھ سے اچھی طرح بن آوے"۔ ان تقریبات کے ادا کر چکنے اثنا میں عضدالدولہ کا ایک افسر جو اُسکے ساتھ تھا اس بُت پرستی سے گھبرا کر بول اُٹھا کہ "کیا یہ خدا ہے جو آپ اسطرح تعظیم بجا لاتے ہیں"۔ عضدالدولہ نے کہا "ہاں۔ یہ خدا کا خلیفہ ہے"۔

مصر میں جب خاندان فاطمیہ نے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی اور خاندان عباسیہ اُن کو دبا نہ سکا تو عباسیوں سے بجز اسکے اَور کوئی تدبیر بن نہ آئی کہ ایک محضر لکھوا لیا جس میں فاطمیہ کے نسب کا انکار تھا اور اُسپر تمام علماء سے دستخط کرائے اور اسطرح لوگوں کو انکی طرف سے برگشتہ کیا جسکا یہ اثر ہوا کہ ایک مدت مدید کے بعد فاطمیہ کے ایک افسر نے خلیفۂ فاطمی کو تخت سے اُتار دیا اور عباسیوں کی سلطنت قائم کر دی۔ یہ افسر صلاح الدین ایوبی تھا جو آج فاتح بیت المقدس کے نام سے تمام عالم میں مشہور ہے۔

سنہ ۶۵۶ھ میں بغداد کی سلطنت جب ہلاکو کے ہاتھ سے تباہ ہو گئی اور خاندان بنی عباس تباہ کر دیا گیا تو اس خاندان میں سے ایک شخص جسکا نام احمد ابو القاسم تھا اور جیلخانہ میں مقید تھا بھاگ کر مصر پہونچا۔ یہاں اس وقت ملک ظاہر بیبرس کی حکومت تھی۔ احمد کے پہونچنے کے ساتھ ظاہر نے ایک بہت بڑا دربار کیا اور بڑے عجز و نیاز کے ساتھ احمد کے ہاتھ پر بیعت کی۔ احمد کی وفات کے بعد چونکہ اُسکے کوئی اولاد نہ تھی اسلئے ایک اَور عباسی شہزادہ جو بغداد کی تباہی میں بچگیا تھا خلیفہ کیا گیا۔ اور ایک مدت تک اُسکے خاندان میں یہ (برائے نام) خلافت رہی۔ یہ خلفا اگرچہ اسقدر بے اختیار اور بے حقیقت تھے کہ اُنکو بجز مقررہ وظیفہ کے کسی قسم کی حکومت حاصل نہ تھی۔ تاہم مذہبی عظمت یہ تھی کہ بادشاہ وقت ہمیشہ اُن کے آگے سر جھکاتا تھا۔ ہندوستان کے مشہور بادشاہ تغلق نے اسی خاندان کی سلطنت کا فرمان منگوایا تھا اور اسپر اسقدر

خوشی کا اظہار کیا تھا کہ تمام شہر آئینہ بندی کرائی اور شعرا نے مبارکبادی کے قصیدے لکھے۔ بدر چاچ کے ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے :-

جبرئیل از طاقِ گردوں اَلبشر واگویاں رسید
کز خلیفہ سوئے سلطاں خلعت و فرماں رسید

غرض تیرہ سو برس سے آجتک کسی ایسے خاندان نے کبھی خلافت کا دعوٰی نہیں کیا جو قریش کے خاندان سے نہ رہا ہو۔ ناظرین کو حیرت ہوگی کہ اگر ایسا ہی ہو تو ٹرکی خاندان کو کیوں خلافت کا دعوٰی ہے۔ حالانکہ یہ عموماً مسلّم ہے کہ ترک قریش کے خاندان سے نہیں ہیں۔

یہ واقع درحقیقت تعجب انگیز ہے اور واقع کا سبب اس سے زیادہ تعجب انگیز ہے۔ ترکوں میں بایزید ثانی تک جو اس خاندان کا آٹھواں بادشاہ تھا کسی حکمران نے خلافت کا لقب نہیں اختیار کیا تھا۔ چنانچہ آج بھی ترک مصنفین اُس زمانہ تک کسی ترکی بادشاہ کو خلیفہ کے لقب سے یاد نہیں کرتے۔ سلطان سلیم اوّل جو ۹۱۸ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھا۔ جب مصر فتح کیا تو اُسوقت وہاں عباسی خاندان کا ایک برائے نام خلیفہ موجود تھا جسکا نام المتوکّل تھا (یہ وہی خاندان تھا جسکا ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں) سلطان سلیم اس کو بجبر قسطنطنیہ لایا اور اسکو مجبور کیا کہ خلافت کے لقب سے دست بردار ہوجائے۔ اور یہ لقب سلیم کے نام منتقل کردے۔ متوکّل اگرچہ اس پر راضی نہ تھا لیکن مجبوراً اُسکو قبول کرنا پڑا۔ چنانچہ مسجد ایا صوفیہ میں جاکر اس نے اسبات کا اعلان کیا۔ اور یہ پہلا دن ہے کہ ٹرکی خاندان کے ساتھ یہ فرضی لقب اضافہ کیا گیا۔ یہ واقعہ اگرچہ بظاہر مضحکہ آمیز ہے لیکن خود ترک مؤرخین اسکے مُعترف ہیں اور ترکی تاریخوں میں جہاں سلطان سلیم کا ذکر ہے یہ واقعہ بھی ساتھ ہی مذکور ہے ❖

خلافت کی حقیقت

بعض مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مسلمان سلاطین دنیا میں سے کوئی ایک بادشاہ خلیفہ ہوتا ہے اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے وہ تمام دنیا کے مسلمانوں پر کسی قسم کا اقتدار رکھتا ہے اور یہ منصب چند نسلوں سے سلاطین ٹرکی کو حاصل ہے۔ امر تحقیق طلب یہ ہے کہ مذہب اسلام کے رُو سے ایسی خلافت کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں۔

خلیفہ کے معنے ہیں جانشین کے یعنی جو دوسرے کی جگہ پر بیٹھے پس اگر ایک بادشاہ کی نسبت کہا جائے کہ وہ اپنے باپ یا بھائی کا جسکی جگہ پر وہ بیٹھا ہے خلیفہ ہے تو لفظ خلیفہ کا استعمال صحیح معنوں میں کیا جائیگا۔ کیونکہ ایک شخص دوسرے شخص کا خلیفہ اسی حالت میں ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے منصبی اوصاف میں یکسانیت ہو۔ اگر یہ نہ ہو تو ایک دوسرے کا خلیفہ نہیں کہلا سکتا۔ لیکن اگر خلافت کو اسکے ان اصلی اور صحیح معنوں میں استعمال کیا جائے تو ہر ایک مسلمان بادشاہ کو کہلانے کا مستحق ہونا چاہئے کیونکہ ہر ایک ان میں سے بادشاہ سابق کا جانشین ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سلاطین ٹرکی کو خلیفہ اس بنا پر نہیں کہا جاتا بلکہ کسی اور بنا پر۔

خلیفہ کے ایک اور معنے نائب کے بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں خدا نے آدمؑ یا انسان کو استعارتاً اپنا خلیفہ فرمایا ہے وہاں اسکے معنے نائب کے ہیں۔ جانشین اور نائب کے عام فہم معنوں میں یہ تفاوت ہے کہ ایک شخص جانشین اُسوقت بنتا ہے جب شخص متقدم فوت ہو جائے یا اپنے منصب سے علیحدہ ہو جائے۔ لیکن نائب کی حالت میں یہ ضروری ہے کہ جس شخص کا وہ نائب ہو وہ زندہ ہو اور اُس منصب پر موجود ہو۔

قرآن مجید میں خلافت کا لفظ سلطنت کے معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت میں :-

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے ہیں ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ انکو ملک کی خلافت (یعنے سلطنت) ضرور عنایت کرے گا۔

خلافت کے ان معنوں کے لحاظ سے اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ جس خلافت کا سلاطین ٹرکی دعوےٰ کرتے ہیں یا ان سے منسوب کی جاتی ہے وہ کیا چیز ہے۔

قرآن مجید میں جن معنوں میں انسان کو خدا کا خلیفہ کہا گیا ہے اس خلافت کا اطلاق تو ہر ایک انسان پر ہو سکتا ہے۔ اور اس میں کسی ایک شخص یا جماعت کی خصوصیت نہیں ہے اسی طرح آیت مندرجہ بالا میں جو خلافت یعنی سلطنت مذکور ہے وہ مطلق سلطنت ہے اور تمام مسلمان سلاطین اس میں داخل ہیں۔

اس صورت میں مذہب اسلام میں کسی ایسی خلافت کا کوئی پتہ یا نشان نہیں ملتا ہے جو ایک دنیوی بادشاہ کی حیثیت میں کوئی ایسی خصوصیت پیدا کرتی ہو جس کی وجہ سے تمام مسلمانوں کو خواہ وہ اسکی عملداری میں یا اس کے باہر ہوں اس کی متابعت کرنا یا اسکا کسی قسم کا اقتدار تسلیم کرنا لازم آتا ہو۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ شاہانِ ٹرک کا یہ دعویٰ اس خلافت پر مبنی ہے جسکے رُو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار اصحاب کبار یعنی حضرت ابوبکر۔ حضرت عمر۔ حضرت عثمان اور حضرت علی (رضی اللہ عنہم) کو خلیفہ کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے۔ یا شاہان بنی اُمیہ اور بنی عباس وغیرہ نے اپنے لئے یہ لقب اختیار اور استعمال کیا ہے۔ اس خلافت کا مفہوم جو عوام مسلمانوں میں سے اکثر یا بعض کے دلوں میں پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ خلافت حضرت سرورِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی جو حضرت ابوبکر رض سے شروع ہوئی اور بعد ازاں جاری رہی۔ اور اسی سلسلہ میں رفتہ رفتہ سلاطین ترک کو پہونچی ہے۔ اس صورت میں امر بحث طلب اور فیصلہ طلب یہ ٹھہرتا ہے کہ آیا جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی خلافت ہو سکتی ہے یا نہیں۔

مذہب اسلام میں تو ایسی خلافت کی بابت کوئی حکم نہیں پایا جاتا ہے اور ناممکن تھا کہ ایسا کوئی حکم ہوتا۔ ہر ایک مسلمان کا یہ عقیدہ اور ایمان ہے۔ اور جسکا یہ عقیدہ نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہو سکتا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خاتم النبین و خاتم المرسلین تھے پس مِن حیث النبوت تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خلافت محالات سے ہے لیکن قرآن مجید یہ ہدایت کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے منصب نبوت یا رسالت کے علاوہ ایک اَور منصب بھی برگزیدہ اشخاص کو عطا فرمایا ہے۔ جس کا نام امامت ہے

رسول کی تعریف جو قرآن مجید میں کی گئی ہے وہ اس ایک آیت سے کافی طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝	کہ تمہاری جنس کا ایک رسول ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے جو ہماری آیتیں تم کو پڑھ کر سناتا ہے۔ تمہاری اصلاح کرتا ہے۔ کتاب (قرآن) پڑھاتا ہے حکمت سکھاتا ہے اور ایسی ایسی باتیں بتاتا ہے جسے تم نہ جانتے تھے۔

امام کا جن الفاظ میں قرآن مجید میں ذکر آیا ہے وہ حسب ذیل آیات میں پایا جاتا ہے:-

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۝	اور جب اللہ نے ابراہیم کو کئی باتوں میں آزمایا اور ابراہیم نے انھیں پورا کر دکھایا۔ اللہ نے اس (ابراہیم) سے کہا میں تجھکو سب لوگوں کا امام (یعنے پیشوا) بناؤنگا۔ ابراہیم نے کہا میری نسل اولاد کو بھی۔ اللہ نے کہا ہاں۔ مگر میرے اس اقرار میں وہ داخل نہیں ہیں جو ظالم ہوں گے۔
وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ ۖ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ ۝	اور ہم نے اُنہیں امام یعنے پیشوا بنایا کہ ہمارے حکم سے وہ لوگوں کی رہنمائی کریں۔ انکی طرف ہم نے نیک کام کرنے نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے کا حکم بھیجا۔ یہ سب ہماری عبادت کرنے والے تھے۔
وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ۝	اور ہم نے ان میں امام بنائے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے یہ منصب امامت انکو اسوقت ملا جب وہ کافروں کی ایذادہی پر صبر کئے بیٹھے رہے اور ہماری آیتوں کا یقین بھی رکھتے تھے

احکام قرآن مجید سے جو رسالت اور امامت کے بارہ میں ہیں جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ مختصر طور پر یہ ہے۔

(۱) رسالت اور امامت کے منصب جدا جدا ہیں۔

(۲) رسالت خدا کے احکام کو پہونچانے اور سکھلانے پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور امامت سے مراد اس تعلیم کی عملی ہدایت ہے۔

(۳) دونوں منصب ایک وقت میں ایک شخص کی ذات میں جمع ہو سکتے ہیں۔

(۴) منصب رسالت کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن منصب امامت ختم نہیں ہوا۔

(۵) منصب رسالت اور امامت دونوں خداوند تعالیٰ کیطرف سے خاص انسانوں کو عطا کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ جسطرح کہ قرآن مجید میں نبوّت کے بارہ میں جَعَلَ کا لفظ جَعَلَنِی نَبِیًّا میں آیا ہے اسی طرح امامت کے متعلق آیات مندرجہ صدر میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی یہ دونو منصب عطیۂ الٰہی ہیں اور وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہیں جنہیں ایک انسان دوسرے انسان کو دے سکے یا کسی خاص جماعت یا فرقے یا خاندان کے لئے مخصوص ہوں ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس صورت میں رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خلافت صرف آنحضرتؐ کے منصب امامت کے اعتبار سے ممکن ہے لیکن وہ بھی ایک مخصوص مذہبی منصب ہے۔ نہ کہ کوئی دنیوی عہدہ۔

اس کے سوائے اور کوئی منصب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نہیں تھا۔ البتہ مخالفین اسلام آنحضرتؐ کی ذات اقدس پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اُن کا مقصود اور مدعا درحقیقت ایک دنیوی سلطنت قائم کرنیکا تھا اور مذہب کو اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے ایک آڑ اور بہانہ بنایا گیا تھا۔ جو درحقیقت محض ایک ڈھکوسلہ تھا۔ مخالفین تو اور ایسی بہت سی خلاف واقع باتیں کہتے ہیں۔ لیکن تعجب اور سخت تعجب اس وقت ہوتا ہے جب اچھے خاصے لکھے پڑھے مسلمانوں کی قلم اور زبان سے بھی اس قسم کے فقرے نکل جاتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک سلطنت کی بنیاد ڈال دی تھی۔ یہ کہنا انتہا درجہ کی بے انصافی اور حقیقت حال سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی سلطنت کی بنیاد ڈالی یا کسی مملکت کے قائم کرنے کی کوشش کی اور نہ یہ امر مقاصد رسالت میں جو نہایت اعلیٰ اور اقدس تھا داخل تھا۔ البتہ اگر یہ کہا جائے تو بالکل درست ہو گا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سچے دین کی تعلیم فرمائی تھی کہ اسکے پیرو اپنے اخلاقی محاسن اور فضائل کی وجہ سے دنیوی حیثیت میں بھی غلبہ حاصل کرنے والے تھے اور خدا کا یہ وعدہ پورا ہونے والا تھا کہ:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے ہیں

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ	ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ (ایک نہ ایک دن) ان کو ملک کی خلافت (یعنی سلطنت) ضرور عنایت کرے گا جیسے اُن

لوگوں کو خلافت عنایت کی تھی جو ان سے پہلے ہو گذرے ہیں۔

وہ شخص ظلم کرتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی دنیوی سلطنت قائم کی تھی یا کسی سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ کیونکہ یہ امر صرف واقع کے خلاف بالکل جھوٹا اور قطعاً بے بنیاد ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے شانِ رسالت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہا درجہ کی گستاخی اور بے ادبی ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ دنیوی سلطنتیں مسلمانوں کی بادشاہی سے ہزارہا برس پہلے سے چلی آئی ہیں اور اسکے بعد بھی موجود ہیں۔ یہ ایک ایسی عام چیز ہے کہ ہزاروں نے حاصل کی اور ہزارہا سے چھن گئی۔ عرب کے جس رقبہ کی سلطنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کی جاتی ہے۔ اسکی حقیقت ہی کیا تھی۔ دنیا کے بڑے بڑے جلیل الشان بادشاہوں نے جو دنیا کے بڑے سے بڑے حصوں پر عجیب جاہ وجلال کی بادشاہیاں کر گزرے ہیں۔ اس بارگاہ عالی کا حلقہ بگوش اور غلام کہلانا اپنے لئے موجب فخر سمجھا ہے۔ اگر شریعت اسلام مانع نہ ہوتی تو مدینہ منورہ میں مقبرۂ رسالت مآب کی چوکھٹ سے ہزاروں ایسی سنہری زنجیریں لٹکتی نظر آتیں۔ جیسی کہ نجف اشرف میں نادرشاہ درانی شاہِ ایران کی حاضری کی یادگار موجود ہے[1]۔ جو مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی سلطنت کا بانی مبانی بیان کرتے ہیں وہ نادانستہ طور پر مخالفین کے اس اعتراض کی تائید کرتے ہیں۔ جو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اتہام لگاتے ہیں کہ ان کی غرض و غایت ایک سلطنت قائم کرنے کی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیوی حکومت کے ساتھ ذرا بھی تعلق اور سروکار نہیں ظاہر فرمایا۔ چونکہ آپ توحید کی تعلیم دینے کے علاوہ شریعت بھی لائے تھے جسکا علاقہ حسن معاشرت اور اخلاق کے ساتھ تھا اور مسلمانوں کے گروہ کی حفاظت بھی جناب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذمہ تھی۔ پس لازمی تھا کہ مسلمان آداب عبادات

[1] نجف اشرف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے روضہ کے شمالی دروازہ پر ایک لمبی سونے کی زنجیر لٹکی ہوئی ہے۔ نادرشاہ جب روضہ میں داخل ہوا تھا تو مثل کتے کے زنجیر گلے میں ڈالکر آیا تھا اور ضریح سے باندھ دیا گیا تھا۔ یہ زنجیر بطور یادگار اب تک وہاں موجود ہے۔

اور قواعد شریعت اور دیگر ضروری امور میں ہدایت حاصل کرنے کے لئے حضور کی طرف ہی رجوع کرتے۔ اور ان امور میں ہدایت کرنا آنحضرتؐ کے منصب امامت سے تعلق رکھتا تھا اور اسی حیثیت میں وہ مسلمانوں کی جماعت کے سردار تھے۔ لیکن اس سرداری کو اس دنیوی بادشاہت کے ساتھ جو عوام الناس کے تصور میں ہے کیا مشابہت ہو سکتی ہے۔ تمام عمر رسول اللہ نے فقر وفاقے میں گذاری اور اسی میں خوش رہے اور اپنے رفیقوں کو بھی اسی کی رغبت دلاتے رہے اس قسم کے بیشمار واقعات کتب احادیث وتاریخ میں موجود ہیں از انجملہ ایک وہ حدیث ہے جسے شیخین نے حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ :-

مَا شَبِعَ اٰلُ مُحَمَّدٍ مِنْ خُبْزِ الشَّعِيْرِ يَوْمَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ حَتّٰى قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	محمدؐ کے گھر والے دو دن متواتر جو کی روٹی سے سیر نہیں ہوئے (یعنی کبھی کوئی موقع ایسا نہیں ہوا کہ دو روز برابر جو کی روٹی سیر ہو کر کھائی ہو) یہانتک کہ جناب

پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے۔

ایک اور واقعہ شیخین نے حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کھجور کے ایک بوریئے پر کروٹ کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ بوریئے پر کسی چیز کا فرش نہ تھا۔ اور اسی وجہ سے جس پہلو پر آپ لیٹے ہوئے تھے اس میں بوریئے کے نقش اُتر آئے تھے۔ چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کے پوست بھرے ہوئے تھے آپ کی گردن مبارک کے تلے رکھا ہوا تھا۔ یہ حالت دیکھکر میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ خدا سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کی اُمت پر توسیع رزق فرمائے۔ اہل فارس اور روم باوجودیکہ خدا کی بندگی نہیں کرتے کیسے ناز ونعمت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسکے جواب میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے خطاب کے بیٹے۔ کیا تو اسی دنیا میں توسیع رزق اور ترفہ اور تنعم طلب کرتا ہے۔ اہل فارس اور روم جو خوشحالی میں زندگی بسر کرتے ہیں ان کے حصہ کی خوبیاں اُن کو اسی زندگی میں دیدی گئی ہیں۔ آخرت میں ان کو بجز عذاب وعتاب کے اور کچھ نہیں ملیگا۔ اے عمرؓ پس تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ یہ نعمتیں انہیں دنیا میں اور ہمیں آخرت میں نصیب ہوں۔

ترمذی نے ابو طلحہ سے ایک اور واقعہ کی روایت اس طرح کی ہے کہ :-

شَكَوْنَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	یعنی ہمنے جناب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی

الجوع فرفعنا عن بطوننا عن حجر حجر فرفع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن بطنہ عن حجرین۔	بھوک کی اور اپنے پیٹوں سے ایک ایک پتھر کھولکر دکھایا جناب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے شکم مبارک سے کپڑا اٹھایا اور دو پتھر کھولکر دکھائے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صدقات کو نہ صرف اپنے نفس پر بلکہ اپنے تمام خاندان یعنی کل بنی ہاشم پر حرام قرار دے دیا تھا۔

ایک روز امام حسنؓ نے جو اس وقت کم عمر تھے صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور منہ میں ڈال لی۔ آنحضرتؐ نے چھی چھی کہکر پھنکوا دی اور فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ ہم بنی ہاشم خیرات کی کوئی چیز نہیں کھایا کرتے۔ مالدار لوگ جب کبھی تحائف بھیجتے تھے تو آنحضرتؐ اس خیال سے کہ ان کی دلشکنی نہ ہو رکھ لیتے تھے اور لوگوں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ جو تنگی اور بے سامانی شروع میں تھی وہی آخر تک رہی۔ مسجد نبویؐ کی شان یہ تھی کہ لکڑیوں پر پتے ڈالدئے گئے تھے اور ان پر مٹی ڈالنے اور چننے میں آنحضرتؐ بذاتہٖ شریک رہے۔ جنگ بدر میں جب آپ تشریف لے گئے تو دس آدمیوں کے پاس بھی گھوڑے نہ تھے اور تین سو تیرہ (۳۱۳) ہمراہیوں میں سے سب کے پاس تلواریں بھی نہ تھیں۔ جس تنگی اور افلاس میں حضور کی زندگی بسر ہوئی اسکا ثبوت اس واقعہ سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ بستر مرگ پر پڑے ہوئے ہیں اور گھر میں اندھیرا ہے۔ چراغ جلانے تک کی وسعت نہیں۔ کنبہ کے کھانے کے لئے کوئی چیز موجود نہیں اور آپکی زرہ مدینہ کے ایک یہودی کے پاس رہن کر کے جو کا آٹا لایا گیا ہے۔ کوئی مہمان آگیا ہے تو گھر بھر میں سے روٹی کا ٹکڑا نہیں نکل سکا۔ یہ ہے وہ بادشاہی جسمیں رسول اکرمؐ نے اپنی مبارک زندگی بسر کی اور اس زندگی کو ترجیحاً اختیار کیا۔ بمقابلہ اس کے جو تمام قوم قریش نے مکہ سے ہجرت فرمانے سے پیشتر آپ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ قریش مکہ نے جب دیکھا کہ آپ تمام قسم کی انتہائی سختیوں اور ایذاؤں کے باوجود ان کے بتوں کی مذمت کرنے سے باز نہیں آسکتے تو انہوں نے مغیرہ بن شعبہ کو جو ایک بڑا مالدار اور ذی وجاہت رئیس تھا وکالتاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ اس نے حاضر ہو کر خلاف معمول نہایت نرمی اور ملائمت اور تسلی و دلجوئی کی باتیں کرنی شروع کیں۔ اور کہا کہ:- اے میرے بھتیجے! تم صاحب اوصاف جمیلہ اور عالی خاندان ہو۔ پھر کیا

سبب ہے کہ ہمارے معبودوں کو سب و شتم کے ساتھ یاد کرتے ہو اور ان کی عبادت کی وجہ سے ہمیں بے وقوف اور پاگل کہتے ہو۔ اور ہماری قوم میں تفرقہ ڈالتے ہو۔ اگر تمہارا مقصود یہ ہے کہ کسی مالدار حسین و جمیل عالیخاندان عورت سے تمہاری شادی ہوجائے تو مکہ بھر میں جس عورت کو تم پسند کرو ہم ابھی اس سے تمہاری شادی کرادیتے ہیں اگر مال و زر مطلوب ہے تو ہم ابھی تمہارے پاس اسقدر دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ دولتمند ہوجاؤ گے۔ اور اگر حکومت اور سرداری کی تمنا ہے تو ہم سب لوگ تمکو اپنا سردار بلکہ بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اور عہد کرتے ہیں کہ ہم تمہاری طاعت میں اسیطرح سر تسلیم خم کئے رہینگے اور تمہاری فرمانبرداری بالکل اسیطرح کریں گے جس طرح ایک بڑے جلیل القدر جبّار بادشاہ کی کی جاتی ہے"۔

مغیرہ جب اپنے اس پیغام اور گفت وگو کو ختم کرچکا تو اسکے جواب میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیات پڑھنی شروع کردیں جن میں توحید باری کا بیان اور شرک اور بت پرستی کی مذمت ہے اور وہ ان کو سن کر اپنا سا مونھ لیکر واپس چلا گیا۔

بفرض محال اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی سلطنت قائم کی تھی یا قائم کرنی مقصود تھی تو وہ ان کے اپنے خاندان بنی ہاشم کی سلطنت ہونی چاہیئے تھی۔ اور اس صورت میں وہ اپنے نواسوں امام حسنؓ اور امام حسینؓ میں سے یا اپنے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ یا کسی اَور شخص کو بنی ہاشم میں سے اپنی جانشینی کے لئے نامزد فرماتے۔ لیکن جو کچھ ظہور میں آیا اور تمام دنیا نے دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے رحلت فرماجانے کے بعد مسلمانوں کے پہلے امیر حضرت ابوبکرؓ ہوئے جو ساتویں پشت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملتے ہیں۔ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ جو آٹھویں پشت میں جناب رسالت مآبؐ سے ملتے ہیں۔ اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ امیر ہوئے جو چھٹی پشت میں آنحضرتؐ سے ملتے ہیں۔ اور جنکے خاندان بنی امیہ کو بنی ہاشم سے قدیم سے عداوت چلی آتی تھی۔ اور ان کے بعد حضرت علیؓ امیر ہوئے اور ان کے بعد بنی امیہ کی سلطنت قائم ہوگئی جنہوں نے بنی ہاشم یعنی خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے نابود کردینے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

یہ امر کامل یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ حضور انورؐ نے اپنی تمام پاک زندگی میں کبھی صراحۃً یا کنایۃً ایک لفظ بھی اس بارہ میں نہیں فرمایا۔ اور اس لئے نہیں فرمایا کہ وہ صرف حکم الٰہی کی تعمیل کرتے تھے۔ بڑی سرکار سے جو حکم ہوتا تھا اُسکو سُنا دیتے تھے۔ اور اپنی ذاتی خواہش کے لحاظ سے ایک لفظ بھی نہیں کہتے تھے اور یہ اُن کے نبی صادق ہونے کی ایک دلیل ہے۔ اگر آپؐ نے کبھی اسبارہ میں کہ انکے بعد مسلمانوں کا امیر یا سردار کون ہوگا کوئی حکم فرمایا ہوتو وہ واقعات کبھی ظہور پذیر نہ ہوتے جو بعد ازاں ہوئے۔

جب آفتاب رسالت غروب ہوگیا تو ابھی حضور انور کی نعش مبارک گھر کے اندر ہی رکھی ہوئی تھی اور تجہیز و تکفین کی تیاریاں ہورہی تھیں کہ منافقین کے بہکانے سے جو اس موقعہ کے انتظار میں تھے حضرت انصار یعنی اہل مدینہ سقیفہ بنی ساعدہ میں اس غرض سے جمع ہوئے کہ آئندہ اپنی سرداری کے لئے اپنے میں سے ایک شخص کو منتخب کرلیں۔ چنانچہ انہوں نے قبیلہ بنی خزرج کے رئیس سعد بن عبادہ کو منتخب کرہی لیا تھا۔ مگر بیشتر اسکے کہ یہ مجلس برخاست ہوئے حضرت عمرؓ کو ایک انصاری سے اس واقعہ کی اطلاع مل گئی اور وہ حضرت ابو بکرؓ کو ساتھ لے کر سقیفہ بنی ساعدہ کیطرف دوڑے۔ راستہ میں اُن کو ابو عبیدہ بن جراح اور چند اور مہاجرین یعنی اہل مکہ مل گئے اور وہ بھی ساتھ ہولئے۔ سقیفہ میں پہونچنے کے بعد جو مناقشہ مہاجرین اور انصار کے درمیان ہوا اسکی تفصیل بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ چونکہ سعد بن عبادہ کے انتخاب کو جو بنی خزرج کا سردار تھا۔ بنی اوس جو مدینہ کا دوسرا طاقتور قبیلہ تھا قدیم رقابت کی وجہ سے دل سے نہیں پسند کرتا تھا۔ انکی تائید سے مہاجرین کامیاب ہوگئے اور یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کا آئندہ سردار قریش میں سے ہو۔ اُسوقت دوسرا سوال یہ پیش آگیا کہ قریش میں سے ہو تو کون ہو۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ عمر اور عبیدہ دونوں میں سے ایک کو منتخب کرلیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ابو عبیدہ مجھ سے بہتر ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو امین ھذہ الامۃ کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ ابو بکرؓ اس منصب کے لئے سب سے زیادہ موزون ہیں اور اس پر حضرت عمر اور حضرت ابو عبیدہ کا اتفاق ہوگیا اور تمام مہاجرین اور انصار نے جو وہاں موجود تھے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

یہ ہیں حالات اور یہ ہے کیفیت اُس کارروائی کی جوان خاص واقعات کے پیش آجانے کی وجہ سے حضرت ابوبکر رض کے انتخاب کے وقت عمل میں آئی۔ اگر یہ مانا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد یا کوئی اشارہ کسی خاص شخص کو یا کسی خاص قوم یا جماعت میں سے خلیفہ یا سردار منتخب کرنے کے بارہ میں تھا۔ تو ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اسلام کی تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کا اثر اسقدر کمزور اور ایسا سرسری اور سطحی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لیجا نیکے ساتھ ہی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دلوں سے محو اور معدوم ہوگیا۔ انصار مدینہ جنھوں نے اسلام اور بانی اسلام اور اُن کے ستم رسیدہ رفیقوں یعنی مہاجرین مکہ کو پناہ دی تھی اپنے اپنے املاک کا نصف ہر ایک نے اپنے ملکی مہمانوں کے حوالہ کرکے عقد مواخات[1] کی ایک عظیم الشان اور بے مثل نظیر دنیا میں قائم کی تھی۔ جنھوں نے اسکے بعد پیغمبر خدا اور اسکے دین کی حفاظت میں اپنے مال اور جانیں فدا کیں اور پانی کی طرح اپنا خون بہایا۔ اور اصحاب رسول اللہ کا معزز لقب حاصل کیا۔ ان کی یہ تمام کارروائی محض ایک ریاکاری اور منافقت تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ظاہر ہوگئی۔ اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑیگا کہ حضرت ابوبکر رض جن کا خطاب صدیق اور عتیق تھا اور جو اسلام لانے کے وقت سے سایہ کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے تھے۔ اور حضرت عمر رض جو فاروق لقب رکھتے تھے اور حضرت ابو عبیدہ رض جو امین الامت کے امین تھے وہ یا تو رسول اللہ کے اس حکم سے ناواقف تھے جو بجائے خود ایک ناممکن امر ہے۔ اور ان سے بھی کوئی ایسی عظیم غلط کاری وقوع میں آنا ممکن تھی کہ اصلیت کو چھپا رکھتے۔ کیونکہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جو تقریریں ہوئیں اس میں دونوں فریق میں سے کسی نے نہیں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسبارہ میں کوئی حکم ہے۔

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت فرماکر مدینہ تشریف لائے اور انکے بعد دیگر مہاجرین بھی پہونچگئے تو انکی حالت سخت بے سروسامانی کی تھی۔ انصار یعنی مسلمانان مدینہ نے ان افلاس زدہ مہاجرین سے ایک بھائی بندی کا معاہدہ کیا جو عقد مواخات کہلاتا ہے جسکے رُو سے ہر ایک انصار نے ایک مہاجر کو اپنے گھر میں آباد کیا۔ نصف مکان اور اپنے تمام مال ومتاع اور سامان خانہ داری اور ضروریات زندگی سے نصف اسکے حوالہ کردیا حتیٰ کہ بعض لوگوں نے اگر انکی دو منکوحہ عورتیں موجود تھیں تو ایک کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی سے اسکا عقد کرادیا۔

حضرت ابوبکر رض کے بعد حضرت عمر رض اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا انتخاب کسطرح ہوا۔ اس کو چند الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ حضرت ابوبکر رض نے اپنی وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ میرے بعد عمر رض میرا جانشین ہو۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی تو بعض اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رض کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت عمر رض کی درشتی طبیعت کے لحاظ سے اس انتخاب پر اعتراض کیا۔ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہ مانا اور فرمایا کہ عمر اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزون ہیں۔ حضرت عمر رض جب ایک ناگہانی آفت کی وجہ سے کہ ایک شخص نے ان کے پیٹ میں خنجر مار دیا تھا زندگی سے مایوس ہوئے تو انہوں نے چھ آدمیوں کو نامزد کیا جن میں حضرت علی رض اور حضرت عثمان بھی تھے کہ اپنے میں سے وہ ایک شخص کو امیر منتخب کرلیں۔ بعدہٗ باقی چار اشخاص امیدواری سے دست کش ہو گئے۔ اور سوال حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے درمیان رہ گیا۔ اور حضرت عثمانؓ کا انتخاب کیا گیا۔ اور جب حضرت عثمانؓ وفات پا گئے تو حضرت علیؓ امامت پر فائز ہو گئے۔

ان واقعات کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو ہر ایک شخص آسانی سے اس نتیجہ پر پہونچ سکے گا کہ وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کی جاتی ہیں کہ انھوں نے قریش کی امارت کے بارہ میں کوئی حکم فرمایا تھا۔ یا یہ کہ حضرت ابوبکر حضرت عمر حضرت عثمان اور حضرت علی کے اسی ترتیب سے خلیفہ ہونے کے بارہ میں جس ترتیب سے کہ وہ ہوئے ارشاد فرمادیا تھا سب وضعی ہیں۔ اور اس وقت کی وضع کی ہوئی ہیں جب یہ سب واقعات گذر چکے تھے۔ کیونکہ اگر کوئی ارشاد اس بارہ میں موجود ہوتا تو کبھی انصار مدینہ اپنے میں سے سردار منتخب کرنے کی جراٗت نہ کرتے۔ اور نہ حضرت ابوبکر رض کے انتخاب کے وقت کوئی چون و چرا نہ حضرت عمر کے تقرر کے وقت کوئی گفت وگو اور نہ حضرت عمر چھ اصحاب میں سے ایک کے انتخاب کی تجویز فرما جاتے۔ اسی طرح سے بعض اشخاص کا یہ مقولہ بھی غلط ہے کہ اسلام یا بانی اسلام نے ایک جمہوری سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ قرآن یا حدیث میں کوئی حکم کسی دنیوی سلطنت کے قائم کرنے یا اس کی نوعیت کی بابت نہیں ہے۔ البتہ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام نے اس کے پیرؤں کے درمیان جو مساوات اور اخوت قائم کی تھی۔ اس نے ایک جمہوریت کا سپرٹ

یعنی روح مسلمانوں میں پیدا کر دیا تھا۔ اور جب تک وہ سپرٹ موجود رہتا اگر کوئی سلطنت قائم ہوتی تو وہ جمہوری ہی ہو سکتی تھی تو بالکل درست ہو گا۔

اس موقعہ پر میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید کی اس آیت میں جس کو میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ:۔

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک عمل بھی کرتے ہیں ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ (ایک نہ ایک دن) ان کو ملک کی خلافت (یعنی سلطنت) ضرور عنایت کرے گا جیسے ان لوگوں کو خلافت عنایت کی تھی جو ان سے پہلے ہو گذرے ہیں"۔

ایک عام حکم ہے جسکا اطلاق ہر زمانہ کے مسلمانوں پر ہے بلکہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں اس سے بھی زیادہ عمومیت ہے جس میں مطلق صالحیت کو وجہ حصول سلطنت ٹھہرایا ہے:۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝	اور ہم زبور میں پند و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ چکے ہیں کہ ہمارے نیک بندے زمین کی سلطنت کے وارث ہوں گے۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت سوا دو برس کے قریب رہی اور یہ تمام عرصہ اس فتنہ اور فساد کے فرو کرنے میں گذر گیا جو بعض مدعیان نبوت کے پیدا ہو جانے یا لوگوں کے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دینے سے رونما ہوا تھا۔ مسلمان ان کو خلیفہ کے نام سے پکارتے رہے اور وہ خلیفہ کہلاتے رہے لیکن جب حضرت عمرؓ جانشین ہوئے جو در حقیقت مسلمان عربوں کی سلطنت کا بانی کہلانے کے مستحق ہیں۔ کیونکہ انہیں کی دس برس کی امارت کے عرصہ میں مسلمانوں نے دو بڑی عظیم الشان سلطنتوں کو تہ و بالا کر کے ان پر قبضہ کر لیا۔ اور جو تمام اوصاف کے جامع اور انتہا درجہ کے دور اندیش اور دوربین تھے۔ جن کی شان میں رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتا۔ ان کو خلیفہ کے لفظ سے کچھ کھٹکا پیدا ہوا کہ کہیں آئندہ زمانہ میں اس سے کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ چنانچہ انہوں نے اس لقب کے استعمال کو ترک کر دیا اور مسلمانوں کو کہا کہ ان کو امیر المؤمنین کے نام سے پکارا کریں۔ اور جب تک زندہ رہے اسی لقب سے پکارے جاتے رہے۔ حضرت عمرؓ کے اس فعل سے بڑھ کر خلیفہ کے معنے اور حیثیت کی تشریح کرنے والی اور کوئی چیز

نہیں ہو سکتی ہے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ دونوں اپنے زمانہ میں حضرت عمرؓ کے دستور کے مطابق امیر المؤمنین ہی کہلائے اور ان کے بعد جب حکومت امیر معاویہؓ کے ہاتھ آئی جو بنی امیہ میں سے تھا تو وہ بھی اسی قاعدہ کا پابند رہا اور امیر المؤمنین کہلانے پر قانع رہا۔ جس شخص نے اس لقب کو ترک کیا اور عمداً اور ارادتاً خلیفہ کا لقب اختیار کیا وہ امیر معاویہؓ کا بیٹا یزید تھا۔ یہ وہ شخص ہے جسکے نام پر ہر اسلامی سال ہجری کے آغاز میں کم از کم دس روز تک دنیا کا ہر ایک مسلمان لعنت بھیجتا ہے۔ اور جب تک مسلمان دنیا میں ہیں (اور انشاء اللہ ہمیشہ موجود رہیں گے) یہ خراج شقاوت سال بسال اس کو ادا کرتے رہیں گے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیاری اولاد کو ایسی بے رحمی اور بے دردی اور وحشیانہ طریق سے ذبح کرایا کہ اس کی یاد سے مسلمانوں کے دلوں میں ہمیشہ درد کی ٹیسیں اٹھتی رہیں گی۔ یہ وہ شخص ہے جس نے خاندان بنی ہاشم کا نام دنیا سے گم کر دینا چاہا۔ اور سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم کے ننھے ننھے معصوم بچوں کے گلوں پر چھری پھروا دینے سے دریغ نہ کیا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے احکام اور شعائر اسلام کو بے دھڑک اور بے دریغ توڑا۔ مکہ اور مدینہ میں خونریزی کی۔ کعبہ کی توہین کی اور مسجد نبوی کو مدینہ میں گھوڑوں کا اصطبل بنایا۔ جس نے اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا اور جس جمہوریت کے اصول پر مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی تھی اسکو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔

کیا یہ شخص اُن شہداء مظلوم کے پاک جدامجد کا جن کی دردناک صدائیں ابتک میدانِ کربلا سے اُٹھ رہی ہیں خلیفہ تھا؟ کیا یہ شخص ابو بکر۔ عمر اور علی رضی اللہ عنہم کا جانشین تھا اور کیا خلیفہ کا لقب جو اس شخص نے اختیار کیا تھا دنیا میں کسی مسلمان کے لئے کسی عزت کا موجب ہو سکتا ہے؟ یہ دوسری بات ہے کہ حکمرانانِ خاندان بنی امیہ میں سے عمر بن عبد العزیز جیسا پاک نفس بزرگ اور ولید بن عبد الملک جیسے جاہ و جلال کے بادشاہ پیدا ہوئے جنکی سلطنتیں وسط ایشیا کو عبور کرتی ہوئی ہندوستان کے مرکزی انقطاع تک اور افریقہ سے گذر کر یورپ میں فرانس کے وسط تک پہنچ گئیں۔ لیکن خلافت ایک مطلق العنان اور شخصی سلطنت کا نام تھا جو شخصی اغراض کے واسطے حاصل کی جاتی تھی اور اسلامیت کا اس میں دخل ہونا یا نہ ہونا ایک غیر معین اور اتفاقی امر تھا۔

بنی اُمیہ کی سلطنت کا خاتمہ بنی فاطمہ اور بنی عباس کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھا
جو شہیدانِ کربلا کا بدلہ لینے کے نام سے ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک جاری
رہیں۔ بنی فاطمہ کے استحقاق سلطنت کو (جس کا نام خلافت رکھا ہوا تھا) بنی عباس
تسلیم کرتے رہے۔ اور ان کے معاون و مددگار بنے رہے۔ لیکن جب بنی امیہ کے
خلاف کامیابی حاصل ہو گئی۔ اور نہ صرف ان کی حکومت برباد ہو گئی بلکہ اس بدنام گھرانے
کا کوئی آدمی سوائے ایک آدھ کے قید حیات میں باقی نہ رہنے دیا گیا تو بنی عباس نے جو
سلوک بنی فاطمہ کے ساتھ کیا وہ اس سے کچھ بہتر نہ تھا جو بنی امیہ نے اُن سے کیا تھا۔ ان کی
سلطنت کے راستہ میں جتنے کانٹے تھے وہ سب تلوار ہی نے صاف کئے اور بنی عباس
کی خلافت قائم ہو گئی۔ جس نے ہارون اور مامون جیسے سلاطین کی حیرت انگیز اور شاندار
یادگاریں چھوڑی ہیں۔ لیکن اگر بنی امیہ اس بنا پر متہم کئے جانے اور ملامت کے مستوجب
ہیں کہ اُنہوں نے بنی فاطمہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لئے تھے تو بنی عباس بھی اس
الزام سے بری نہیں نظر آتے۔ حکومت کی اغراض کے لئے اُنہوں نے بھی آل رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم کی قربانی ایسی ہی جائز قرار دی جیسی کہ بنی اُمیہ کے ہاتھوں سے ہوئی تھی۔
پس یہ سب تماشا تھا دنیاداری اور دنیاگری کا۔ اس کو مذہب سے براہِ راست کوئی
سروکار نہ تھا۔ اور اسکی یہی حیثیت ہمیشہ کے لئے قائم ہو گئی۔

بنی عباس نے جب بنی امیہ کو مغلوب کر لیا تو اُنہوں نے اس بدنام خاندان کے
بدنصیب ممبروں کو چُن چُن کر قتل کرنا شروع کیا اور اپنی دانست میں کسیکو باقی نہ چھوڑا
لیکن ایک نوجوان شخص عبدالرحمٰن جو معاویہ بن ہشام کا بیٹا تھا جان بچا کر بھاگ نکلا
اور اندلس یعنے ہسپانیہ پہونچکر اس ملک کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اور ایک خودمختار
سلطنت قائم کی جسکے تاجدار صدیوں تک حکومت کرتے رہے اور خلیفہ کہلاتے رہے
اسی طرح بعض اَور خاندان جو ان کے بعد اس ملک کے حکمران ہوئے خلیفہ کا لقب
استعمال کرتے رہے۔ ان کو خلافت عباسیہ کے ساتھ اگر کوئی تعلق تھا تو وہ صرف
رقابت اور عداوت کا تھا جیسا کہ دو مختلف سلطنتوں میں ہو سکتا ہے۔ خلافت عباسیہ
جب کمزور ہو گئی تو خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانہ میں مصر اور افریقہ میں بنی فاطمہ یا علویین
(آل علی) کی ایک سلطنت اَور قائم ہو گئی۔ اور اس کے بادشاہ بھی خلیفہ کہلاتے رہے۔

تو گویا ایک ہی وقت میں تین مسلمان خلافتیں موجود تھیں اور تین خلیفے اپنے اپنے ملک میں حکومت کر رہے تھے۔ اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی ترجیح اور فضیلت کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ بلکہ ایک دوسرے کا رقیب اور دشمن تھا۔ اور اپنی اپنی رعایا پر ہر ایک قسم کا کامل اختیار اور اقتدار رکھتا تھا۔ اس صورت میں سوائے اسکے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ خلافت کے معنے سلطنت کے ہیں اور ہر ایک مسلمان حکمران اگر وہ چاہے تو خلیفہ کہلانے کا حقدار ہے۔

مصر اور افریقہ میں جو خلافت بنی فاطمہ نے ۲۹۷ھ (مطابق ۹۰۹ء) میں قائم کی تھی۔ اسکا چراغ جو بہت عرصے سے ٹمٹما رہا تھا آخر کار سلطان صلاح الدین مشہور فاتح بیت المقدس کے ہاتھوں ۵۶۷ھ میں گل ہو گیا۔ اور مصر پر پھر بغداد کی عباسیہ خلافت کا روحانی اقتدار قائم ہو گیا۔ ان تمام خلافتوں کو جو مختلف خاندانوں کی مختلف دیار میں قائم ہوئیں ایک امر میں باہم بہت کچھ مشابہت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب تک ان میں ایسے سلاطین پیدا ہوتے رہے جو سلطنت کے لئے ذاتی قابلیت کے جوہر رکھتے تھے تو تمام حکومت کا اقتدار ان کے اپنے ہاتھوں میں رہا۔ اور جب کمزور یا عیش پسند یا بے ہمت خلیفے پیدا ہو گئے تو مختلف اقوام کے لوگوں نے غلبہ حاصل کر لیا اور حکومت ان کے قبضہ میں آ گئی اور خلیفہ تبرک اور تقدس کی ایک علامت بن گیا جو زیادہ تر گوشہ نشین ہوتا تھا۔ امور مملکت سے ان کا کچھ تعلق نہیں ہوتا تھا۔ یہ محض ان کے عقیدہ کا نتیجہ تھا۔ یا اس میں کچھ ملکی مصلحت مضمر تھی۔ کہ یہ سلاطین اس برائے نام خلافت کے زیر سایہ فرمانروائی کرتے تھے اور ان حکمران خاندانوں کی تبدیلیاں خلافت پر کوئی اثر نہیں پیدا کرتی تھیں۔ خلافت عباسیہ تو صدیوں تک اسی حالت میں رہی۔ اور اس کیفیت کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو وہ یورپ کے عیسوی مذہبی پیشواؤں سے جن کو پوپ کہا جاتا ہے بالکل مشابہ تھی۔

۶۵۶ھ میں بغداد کی خلافت عباسیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ ہلاکو خان کی تاتاری مغولوں کی فوجوں نے نہ صرف بغداد اور بلاد اسلامیہ کو برباد کر کے خاک سیاہ کر دیا۔ بلکہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک کروڑ چھ لاکھ مسلمانوں کو اس نے تلوار کی گھاٹ اتار دیا اور خاندان بنی عباس کی تمام ذریات اسی قتل عام کی نذر ہو گئی۔ غارت گر تاتاریوں کے اس

تباہ کن سیلاب کو مصر کے فرمانروا ملک الظاہر نے جو دولت صلاحیہ کے زوال کے بعد خاندان مملوک (غلاموں) کے بادشاہوں سے اُس ملک میں حکومت کر رہا تھا نہایت کامیابی کے ساتھ روکا اور تاتاری مُنہ کی کھا کر ملک شام سے واپس بھاگنے پر مجبور ہوئے۔ اور خدا کی زمین میں پھر امن نمودار ہوا۔ تو اس عقیدہ نے جو خلافت کے متعلق عام طور پر مسلمانوں کے دلوں میں گہری جڑ پکڑ چکا تھا ملک الظاہر کو ایک خلیفہ کی تلاش کی طرف متوجہ کیا۔ اور اس نے ۶۵۹ھ مطابق ۱۲۶۱ء میں ایک شخص احمد نامی کی نسبت اپنا اطمینان کرنے کے بعد کہ وہ خاندان بنی عباس میں سے ہے۔ المستنصر باللہ کے لقب سے اس کو خلیفہ بنایا اور اسکے ہاتھ پر خود بیعت کی۔ اور اعیانِ سلطنت اور رعایا سے بیعت کرائی۔ اور یہ رسم اسقدر دھوم دھام سے عمل میں لائی گئی کہ ابن خلدون کے بیان کے مطابق ایک کروڑ دینار سُرخ اس تقریب پر خرچ کیا گیا۔ خلیفہ مستنصر چند ہی روز بعد تاتاریوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تو خلافت کے لیئے ایک اور شخص کی ضرورت پیش آگئی۔ اور بہت جستجو کے بعد اُسی احمد نام کا ایک اور شخص دستیاب ہوا جس نے اپنا نسب بنی عباس سے ثابت کیا اور "الحاکم بامر اللہ" کے لقب سے خلیفہ بنایا گیا۔ یہ سلسلہ خلافت عباسیہ مصر میں اسی شکل میں جاری رہا۔ جب تک کہ سلاطین ترکان عثمانی میں سے سلطان سلیم نے یہ منصب اپنے لیئے حاصل نہ کر لیا۔

ابن خلدون اس خلافت کے خاتمہ پر لکھتا ہے کہ" ان کے عہد میں امور خاصہ اور عامہ کے سیاہ وسپید کا اختیار ملوک کو حاصل ہوتا تھا۔ منصبِ خلافت رسمِ خلافت کے پورا کرنے۔ فرائض مذہبی کو برطبق شریعت انجام دینے اور منبروں پر تبرکاً ان کا نام لیئے جانے کی غرض سے تھا جیسے کہ سلاطین ماضیہ اس کے عادی ہو گئے تھے۔ اور بوجہ کمال ایمان اور فرطِ محبت بغرض ایفائے شروط امامت یہ رسم قدیم ادا کی جاتی تھی۔ ملوک ہند اور تمام سلاطین بلاد اسلامیہ ان خلیفوں سے اور ان سے جو ان سے پہلے گذر گئے تھے خطابات اور سندات حکومت حاصل کیا کرتے تھے۔"

چونکہ سنّی مسلمانوں کا عقیدہ یہ تھا کہ خلافت صرف قریش کے لئے مخصوص ہے اور سوائے قریش کے اور کوئی خلیفہ نہیں ہوسکتا۔ اس وجہ سے ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء تک جب

ترکان عثمانی میں سے سلطان سلیم نے اس منصب کو حاصل کیا۔ خلافت خواہ وہ برائے نام تھی قریش ہی میں چلی آئی۔ اور زیادہ عرصہ بنی عباس کی سپردگی میں رہی۔ ۱۳۲ھ (۷۴۹ء) سے لیکر ۶۵۶ھ (۱۲۵۹ء) تک گویا پانچ سو برس تک بنی عباس کی خلافت بغداد میں قائم رہی۔ اور اس عرصہ میں سینتیس (۳۷) خلیفے گذرے۔ پھر ۶۵۹ھ (۱۲۶۱ء) سے ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) تک یعنی اڑھائی سو برس تک بنی عباس کے اٹھارہ (۱۸) خلیفوں نے مصر میں اسی خاندان کے نام کو زندہ رکھا۔ بنی عباس کی ترجیح کی وجہ یہ تھی کہ بنی امیہ نے تو خلافت حاصل کرنیکے ذرائع سے جمہور مسلمانان کو اپنے سے متنفر بنا دیا تھا۔ اور خلفائے بنی فاطمہ کا مذہبی رنگ شیعہ اسمٰعیلی تھا۔ اور عوام مسلمان سنّی حنفی فقہ کے پابند تھے جو بنی عباس کی خلافت کی پیدا کردہ تھی۔

بعض اصحاب ایک مطلق اسلامی سلطنت اور خلافت میں یہ تمیز بیان کرتے ہیں کہ خلافت وہ سمجھی جائے گی جسکے قبضہ میں حرمین الشریفین یعنی اسلامی مقدس مقامات مکۂ معظمہ اور مدینہ منورہ ہوں۔ یا بالفاظِ دیگر جو سلطنت ان مقاماتِ مقدسہ کی محافظ ہو۔ لیکن تاریخی واقعات سے اس امر کی بھی تائید نہیں ہوتی ہے۔

اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا گذرا ہے جب کہ ایک ہی وقت میں تین خلافتیں قائم اور موجود تھیں۔ یعنی بنی عباس کی بغداد میں۔ بنی فاطمہ کی مصر میں اور بنی امیّہ کی اندلس یعنی ہسپانیہ میں۔ بنی عباس نے جب حکومت بنی امیّہ دمشق سے چھین لی تو مقدس مقامات بنی عباس کے قبضہ میں آگئے۔ مگر چوتھی صدی ہجری میں بنی فاطمہ مصر نے اُن پر قبضہ کر لیا اور چھٹی صدی ہجری تک جب کہ سلطان صلاح الدین اور اُس کے خاندان نے امکنۂ مقدسہ کو بنی فاطمہ کے قبضہ سے نکال کر پھر بغدادی خلیفوں کے ماتحت نہ کر دیا۔ بنی فاطمہ ہی کے تصرف میں رہے۔ بغدادی خلفا اس زمانہ میں بھی خلیفہ کہلاتے رہے اور تمام سنی مسلمانوں کے مقتدا سمجھے جاتے رہے جب حرمین الشریفین ان کے قبضہ میں اور زیر حفاظت نہیں تھے۔ اور ہسپانیہ کی اسلامی سلطنتیں بھی باوصف اسکے کہ ان مقدس مقامات پر ان کا کبھی قبضہ نہیں ہوا خلافتیں ہی رہیں۔

اس کے علاوہ بعض زمانے ایسے بھی گذرے ہیں کہ یہ اسلامی مقدس بلاد

ان میں سے کسی خلافت کے تحت نہیں تھے۔ اور بعض قبائلِ عرب نے اپنی خود مختار حکومتیں وہاں قائم کرلی تھیں۔ مگر خلافتیں پھر بھی خلافتیں کہلاتی رہیں۔ اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مکہ اور مدینہ کی حفاظت اور خدمت کرنے والوں نے ہی صرف خلیفہ نہیں کہلایا بلکہ یزید اور اُسکے بعض جانشین جنہوں نے ان مقدس مقامات کو ویران اور پامال کیا اور ان کی کمال درجہ کی گستاخی اور بے ادبی کی وہ بھی خلیفہ ہی کہلاتے رہے۔

خلافت کی بحث میں ایک اَور سوال کا پیدا ہونا بالکل لازمی امر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آیا خلیفوں کے لئے کوئی قید اس قسم کی بھی موجود تھی یا نہیں کہ وہ خدا اور رسول کے حکم کی متابعت کریں۔ شریعت اسلام کے پابند ہوں۔ اور اخلاق محمدی اور اُسوۂ جناب رسالت مآبؐ کے اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔ اگر کوئی اس قسم کا معیار مقرر کیا جائے تو پھر جو خلافت کی شان نظر آئے گی وہ عجیب عبرت انگیز ہوگی۔ خلفائے راشدینؓ کے بعد بنی امیہ دمشق میں سے عمر بن عبدالعزیز کو خلفائے راشدین سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اور بنی امیہ ہسپانیہ میں سے ہشام بن عبدالرحمن داخل یعنی اول کو عمر بن عبدالعزیز ثانی کا خطاب دیا جاتا ہے۔ لیکن اس دائرہ کو اس قدر تنگ نہیں کرنا چاہئے اور یہ مان لینا چاہئے کہ اس وقت تک جن ایک سو اٹھارہ (۱۱۸) سلمان خاندانوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں سلطنت کی ہے ان میں بُرے اور بھلے بادشاہ اسی طریق پر گذرے ہیں جیسے کہ دنیا میں ہمیشہ گذرتے رہے ہیں اور خلیفہ کہلانے والوں کا حال ان کے مقابلہ میں جنہوں نے خلیفہ نہیں کہلایا کچھ بہتر نہیں تھا۔

مسلمان علما تو ضرورتِ وقت کے مطابق ہمیشہ فتوے دینے کے لئے تیار پائے گئے ہیں۔ جب ایک سے زیادہ خلافتیں ایک ہی وقت میں قائم ہوگئیں تو اُنہوں نے ان سب خلافتوں کے جواز کا فتوے دے دیا۔ ہسپانیہ میں جب غیر قریشی خاندان قابض سلطنت ہوگئے تو علما نے حکم دے دیا کہ خلافت کے لئے قریشی ہونے کی کوئی شرط نہیں۔ جب خلیفوں میں بدچلن اور فاسق اور فاجر پیدا ہونے لگے تو علما سے فتوے حاصل کر لیا گیا کہ خلیفہ کے لئے افضل الناس یا معصوم یا عادل ہونیکی

کوئی شرط نہیں ہے اور ایسا نہ ہونے کی بنا پر ان کو معزول نہیں کیا جا سکتا ہے۔ خلیفہ ہونے کے لیے جو اوصاف مقرر کئے گئے وہ یہ تھے کہ آزاد ہو۔ بالغ ہو اور عاقل ہو۔ اور امور ریاست کے انجام دینے کے قابل ہو۔ اس کے سوا ے جو کچھ ہو سو ہو۔ مغلیہ خاندان کے اکبر بادشاہ کو جس نے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھنی چاہی تھی اور نبوّت کا مدعی تھا علما نے اپنے فتوے کے رو سے امام عادل کا لقب عطا کیا تھا۔ ان علما کو جو شاہان وقت کے دست نگر تھے اور جو کچھ وہ چاہیں اسکے کہ دینے پر مجبور تھے چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور مذہب اسلام کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا چاہیئے اور ہر ایک شخص کو اس بارہ میں اپنی خود مختارانہ رائے قائم کرنی چاہیئے۔ کہ وہ لوگ جو سراسر خواہشات نفسانی کے تابع تھے اور اپنے قابل اعتراض رویّہ کی وجہ سے اسلام کو دنیا میں بدنام اور رسوا کرنے کا موجب ہوئے ہیں کیا وہ بانی اسلام علیہ التحیات والسلام کے خلیفہ اور جانشین کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ اگر اسلام کی ہدایت اور تعلیم کے معیار سے دیکھا جائے تو خلیفہ تو ایک طرف رہا ان کو مسلمان کہنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ ان چند صفحات میں یہ امر ناممکن ہے کہ ان تمام خلیفوں کے حالات بیان کئے جا سکیں۔ لیکن مثال کے طور پر ترکان عثمانی میں سے جس فرمانروا نے سب سے پہلے خلیفہ کا لقب اختیار کیا اس کی زندگی کے کارناموں میں سے چند باتیں بیان کی جاتی ہیں[1]

ترکوں میں سے پہلا سلطان سلیم ہوا ہے۔ جس نے خلافت حاصل کی اور خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ خلافت جس طریق سے حاصل کی گئی اس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ ذاتی حالات اس سلطان کے یہ ہیں کہ:-

"۱۵۱۱ء میں اس نے دو دفعہ اپنے باپ سلطان بایزید پر فوج کشی کی اور ۱۵۱۲ء میں اس کو معزول کر کے تخت نشین ہوا۔ اور آٹھ برس تک سلطنت کی وہ بڑا بہادر اور جری اور جنگ جو تھا۔ سلاطین عثمانیہ میں سے سب سے پہلے اس نے داڑھی منڈانا شروع کیا۔ اسکی آنکھیں بڑی اور سرخ تھیں۔ چہرہ اسکا ایسا ہیبت ناک تھا کہ دیکھنے والا خوف کھا جاتا تھا۔ جس طرح اس کی تدبیر سلطنت اور فن رزم اور ستمگری

[1] ان حالات کا ماخذ تاریخ خاندان عثمانیہ ہے جو حمیدیہ پریس لاہور نے شائع کی ہے!

مشہور ہے اسی طرح اس کی بے رحمی اور سفاکی شہرۂ آفاق ہے۔ دشمن اور دوست اور اپنے اور بیگانے یکساں طور پر اس کے قہر اور غضب کا شکار ہوتے تھے۔ اس کے زمانہ میں یہ عام بد دعا تھی کہ خدا تجھے سلطان سلیم کا وزیر بنا دے۔ جو لوگ اس عہدہ پر مامور ہوتے تھے وہ ایک آدھ مہینہ سے زیادہ وزارت پر نہیں ٹھہرتے تھے اور قتل کر دئیے جاتے تھے۔ جس شخص کو وزارت پر تقرر کا حکم پہونچتا تھا وہ اُسی وقت سے سفرِ آخرت کی تیاری شروع کر دیتا اور وصیت وغیرہ سے فارغ ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ اس کے وزیر پیری پاشا نے اس سے عرض کیا کہ چونکہ میں جانتا ہوں کہ تھوڑے عرصہ بعد میرے قتل کے لئے بادشاہ کو عذر ملجائیگا میں سفرِ آخرت کی تیاری کے لئے کچھ مہلت مانگتا ہوں۔ سلیم اس بات کو سُن کر کھل کھلا کر ہنس پڑا اور جواب دیا کہ میں کچھ عرصہ سے تیرے قتل کی فکر میں تھا مگر ابھی تک مجھے تیری جانشینی کے لئے کوئی لائق آدمی نظر نہیں آیا ورنہ میں خوشی سے تجھے ممنون کرتا۔

تخت پر بیٹھتے ہی سلیم نے اپنے دو بھائیوں اور پانچ بھتیجوں کو جن میں کمسن بچے بھی تھے ذبح کرا دیا اور ان کی رحم کی درخواستوں پر کچھ التفات نہ کیا۔

اکثر سلاطین ترک اور خصوصاً اسکے متقدمین ممالک یورپ کی فتح میں مصروف رہے لیکن سلیم نے یورپ کو تو امن کی حالت میں بیٹھنے اور ہسپانیہ سے مسلمانوں کا استیصال کر دینے کا پورا موقعہ دیا۔ اور خود وہ عظیم الشان مسلمان سلطنتوں کے پامال کرنے میں مصروف رہا۔ جن میں سے پہلے ایران اسکی زد میں آیا۔ ایران میں اسوقت شاہ اسمٰعیل صفوی حکمران تھا۔ سلیم کو اسکے ساتھ اول تو اس بنا پر دشمنی تھی کہ وہ شیعہ تھا۔ اور دوسری اس وجہ سے کہ اس نے اسکے ایک مفرور بھائی اور تین بھتیجوں کو پناہ دی تھی۔ سب سے پہلے تو سلیم نے اپنے علاقہ کے شیعوں کا انتظام اسطرح پر کیا کہ خفیہ پولیس کے ذریعہ ستر ہزار آدمیوں کی جن پر شیعہ ہونیکا اشتباہ تھا ایک فہرست تیار کرائی اور پھر ان سب کو گرفتار کرا کر چالیس ہزار کو ان میں سے قتل کرا دیا اور باقیوں کو دائم الحبس کر دیا۔ اس کے بعد اس نے شاہ اسمٰعیل پر چڑھائی کی اور متعدد لڑائیوں میں لاکھوں جانوں کا نقصان ہو گیا۔ پہلی دفعہ جب شاہ اسمٰعیل نے شکست کھائی تو سلیم نے جسقدر قیدی پکڑے تھے سوائے بچوں اور عورتوں کے

سب کو قتل کرا دیا۔ اور ان عورتوں میں شاہ اسمٰعیل کی چاہتی ملکہ بھی گرفتار ہو گئی تھی۔ اسمٰعیل نے چار ایلچیوں کو بمعہ تحائف سلطان کے پاس بھیجا اور اپنی بیگم کو بہ منت طلب کیا۔ لیکن سلیم نے سفیروں کو قید کرا لیا اور بیگم کی شادی ایک سپاہی جعفر کے ساتھ کر دی۔ اسمٰعیل نے بہت دفعہ سلطان سے صلح کر لینے کی درخواست کی۔ مگر اس کا جواب ہمیشہ تیر و تفنگ سے ملا۔

ایران سے فارغ ہو کر سلطان نے مصر کا رخ کیا اور مملوکوں کی عظیم الشان سلطنت کو برباد کر دیا۔ سلطان صلاح الدین نے فتح مصر کے بعد جس سلطنت کی بنیاد رکھی اور جو اسکے باپ ایوب کے نام کی رعایت سے ایوبیہ کہلاتی تھی اسّی برس کے بعد زوال پذیر ہو کر ختم ہو گئی۔ تو سلطنت مملوک کی جو خاندان ایوبیہ کے غلام تھے بنیاد پڑ گئی۔ اور ان میں سے ملک المعز عزالدین ایبک ترکمانی ۶۵۳ھ ۱۲۶۴ء میں سب سے پہلے تخت نشین ہوا۔ مملوک نے اپنی بہادری اور شجاعت کا سکہ بٹھا دیا۔ اور ایک بڑی باشان و شکوہ سلطنت قائم کی جو اڑھائی سو برس تک کامل خود مختاری کے ساتھ اور چھ سو برس تک جزوی طور پر مصر میں موجود رہی۔ ہلاکو کے ماتحت تاتاریوں کا جو طوفان اُٹھا تھا اور وسط ایشیا کی مسلمان حکومتوں کو برباد کرتا ہوا بغداد کی تباہی کے بعد مغرب کیطرف پھیل رہا تھا اسکی طاقت کو انہیں مملوکوں نے توڑا تھا۔ اور عباسی خلافت کو مصر میں از سر نو زندہ کیا تھا۔ سلطان سلیم کا مصر پر حملہ کرنے کا اصلی مدعا تو اس خلافت کے حصول سے تھا اور مصری سلطنت کی ایران کے ساتھ ہمدردی صرف فوجکشی کے لئے ایک بہانہ بنائی گئی تھی۔ یہ خلافت سلیم کو مسلمانوں کے خون کا دریا عبور کر کے ملی۔ مملوکوں نے جو اس کے باپ کو شکست دے چکے تھے ایسی معرکہ کی لڑائی کی کہ سلطان کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ اور یاوری قسمت سے میدان جنگ سے جان بچا کر نکلا۔ کیونکہ مملوکوں کے سردار طومان بے نے قسم کھالی تھی کہ وہ سلیم کو مار ڈالے گا یا زندہ پکڑ لائے گا۔ چنانچہ وہ حملہ کر کے عین قلب لشکر میں جہاں سلیم کھڑا تھا جا پہونچا۔ مگر سنان پاشا کو اس نے سلیم سمجھا اور اسکا کام تمام کر کے ترکی فوج سے نکل آیا۔ آخرکار طومان بے نے اپنے دو افسروں کی غداری کی وجہ سے جنہوں نے سلیم کو ان کے منصوبوں سے مطلع کر دیا تھا۔ اور مملوکوں کی اس جہالت کے باعث

کہ وہ توپ اور بندوق کا استعمال نامردی کی بات سمجھتے تھے اور سلطان سلیم کی سب سے
بڑی طاقت اسی میں تھی شکست کھائی اور بھاگ گیا۔ سلیم قاہرہ کی طرف بڑھا اور تین دن تک
وہاں لڑائی جاری رہا۔ آخر اس نے اعلان کیا کہ جو لوگ ہتھیار رکھ دینگے ان کی جان
بخش دی جائے گی۔ چنانچہ اس اعلان کے شائع ہونے پر لڑائی بند ہوگئی اور آٹھ سو
مملوک سردار ہتھیار ڈال کر سلطانی فوج میں چلے آئے۔ سلیم نے ان سب کو قتل کرا دیا
اور پھر قتل عام کا حکم دے دیا جس میں پچاس ہزار جانیں ضائع ہوگئیں۔ اور بنی عباس کا
آخری خلیفہ محمدؒ جو قاہرہ میں اس قتل و غارت کے بعد نہایت بے کسی کی حالت میں تھا
اپنی خلافت سلیم کے حق میں منتقل کرنے پر راضی ہوگیا۔ اور عَلم اور تلوار اور جُبّہ جو
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے منسوب کئے جاتے تھے۔ مگر جنکا کوئی ذکر خلفائے راشدین
کے تذکروں میں نہیں پایا جاتا اس نے سلیم کے حوالہ کر دئے اور اس کا اثر اور نتیجہ یہ
ہوا کہ خلافت کے اوصاف آئیندہ ترک سلاطین میں پیدا ہوگئے۔

ہم نے جو کیفیت سلطان سلیم کی لکھی ہے یہ کچھ تنہا اس سے مخصوص نہیں ہے
ان تمام بادشاہوں میں جنہوں نے خلیفہ کہلایا ہے سوائے بعض کے اکثروں نے
دنیا داری اور ملک گیری کی غرض سے ایسے ہی تلواروں کے جوہر دکھائے ہیں۔ مخالفین
اسلام تو کہتے ہیں اور کہیں گے کہ قتل اور خونریزی اور غارت گری اور بدعہدی کی
اسلام تعلیم دیتا ہے اور وہ بادشاہ ایسے اسلئے تھے کہ وہ مسلمان تھے۔ لیکن میں
مسلمانوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ سچ ہے۔ کیا اسلام کی تعلیم یہی ہے؟ کیا اسوۂ رسول کریمؐ
یہی تھا۔ اور کیا اسلام کی نیک نامی اور اس کے دینِ حق ہونے کا ثبوت اس طریق سے
ہوگا کہ ان دنیا دار بادشاہوں کو اسلام کے نمائندے اور اسلام کے نمونے ہونے پر
اصرار کیا جائے یا ان مسلمان بادشاہوں کی طرف سے یہ کہا جائے کہ ؎

اسلام بذات خود ندارد عیبے
ہر عیب کہ ہست در مسلمانیٔ ماست

خلافت کی بحث شائد نامکمل رہ جائے گی اگر ایک آیۂ کریمہ کا ذکر نہ کیا جائیگا
جو اس تذکرہ میں اکثر لوگوں کی زبان پر ہوتی ہے اور وہ یہ ہے:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا | مسلمانو! اللہ کا حکم مانو اور رسول اللہ کا حکم

الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ	مانو اور (انکا بھی) جو تم میں سے صاحب حکم ہیں۔

اُولِی الْاَمْرِ کے معنوں میں بہت کچھ گفت وگو کی گئی ہے۔ ایک بحث تو یہ کیجاتی ہے کہ صاحب حکم سے مراد آیا مقتدایان مذہب سے ہے یا ان لوگوں سے جو دنیوی اقتدار رکھتے ہیں۔ بعض متقدمین کی اور ایک لائق مصنف[1] کی جس نے آج کل اس مسئلہ پر ایک رسالہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے یہ رائے ہے کہ اولی الامر کے معنے مقتدایانِ مذہب اور پیشوایانِ دین ہیں نہ کہ حکام دنیوی کے۔ لیکن میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر اسکے معنے حکام دنیوی بھی ہوں تو اس حکم سے کہ تم مسلمان حکام کی تابعداری کرو غیر مسلمان حکام کی تابعداری کی نفی نہیں ثابت ہوتی ہے۔ یعنی اسکے یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ غیر مسلم حکام کی تابعداری نہ کرو۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مسلمانوں کو خواہ وہ انگریزی سلطنت کی رعایا ہوں اور خواہ روسی اور فرانسیسی حکومتوں کے ان کو تابعداری فلاں مسلمان سلطنت کی کرنی چاہئے۔ اور اس کو وہ اسلام کا حکم سمجھے تو وہ مذہب اسلام پر مخالفین کو ہنسی کرنے کا موقع دے گا اور مذہب اسلام کو ایک بہت بڑے الزام کا مورد بنا دے گا۔ کہ وہ ایک ایسا ناممکن اور مہمل حکم دیتا ہے اور اس وجہ سے وہ ایک ناممکل مذہب ہے کہ ایک پیش آنے والی حالت کی بابت مسلمانوں کے لئے اسمیں کوئی معقول اور شائستہ حکم نہیں ہے۔ حالانکہ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ایک بالکل کامل مذہب ہے۔ اور قرآن کریم میں تمام خدائی ہدایتیں جو انسان کے واسطے ضروری تھیں تمام کر دی گئی ہیں اور اس کے بعد کسی کتاب الٰہی کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط

اگر اسلام کی تعلیم یہ ہو کہ غیر بادشاہوں کی تابعداری نہیں کرنی چاہئے تو ایسی حکومتوں کی مسلمان رعایا کے لئے بغاوت اور فساد جائز ہونا چاہئے۔ لیکن مذہب اسلام سے بڑھ کر کوئی مذہب بغاوت اور فساد کا دشمن نہیں ہے۔ قرآن مجید ایسے احکام سے پُر ہے جن میں فساد اور بغاوت کی مذمت کی گئی ہے۔ بار بار فرمایا گیا ہے کہ دنیا میں اور ملک میں فساد مت کرو۔ خدا فساد کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا۔ دوست نہیں رکھتا جو فساد کرتے ہیں وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ اور ایک مقام پر (سورۂ مائدہ میں) تو مفسدین

---

[1] سید ہادی حسین صاحب چلکانوی وکیل عدالتہائے ریاست پٹیالہ نے اسی بحث پر ایک مفصل رسالہ شائع کیا ہے جو ان کو ملسکتا ہے

کے متعلق ایسے سخت احکام نازل ہوئے ہیں کہ ان کو پڑھ کر ایک مسلمان کو کانپ اُٹھنا چاہیئے۔

وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ

اور (جو لوگ) فساد (پھیلانے) کی غرض سے ملک میں دوڑے پھرتے ہیں ان کی تو سزا (بس یہی ہے) کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دئے جائیں یا ان کو سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں اُلٹے (سیدھے) کاٹ دئے جائیں یا ان کو دیس نکالا دیا جائے۔ یا تو دنیا میں ان کی رسوائی (اور اس کے علاوہ) آخرت میں بھی ان کے لئے بُرا عذاب (تیار) ہے۔

مسلمانوں کو جو رویہ کسی غیر مسلم حکومت میں اختیار کرنا چاہئے اُس کو مذہب اسلام نے پورے طور پر واضح کر دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر مسلمان کسی نامسلمان سلطنت کی رعیت بن کر ملک میں رہتے ہوں اور ان کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو اور صرف اسلام کی وجہ سے ان پر ظلم ہوتا ہو تو ان کو دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرنی چاہیئے کہ یا تو وہ ظلم کو برداشت یا اس ملک سے ہجرت کر جائیں یعنے اس ملک کو چھوڑ جائیں۔ البتہ ایسے مسلمانوں کو جو خود مختار ہوں اور اس ملک میں امن لئے ہوئے نہ ہوں یا بطور رعیت کے نہ رہتے ہوں بلکہ دوسرے ملک کے باشندہ ہوں۔ ان مسلمانوں کو بچانے کے لئے جن پر صرف اسلام کی وجہ سے ظلم ہوتا ہو یا ان کے لئے امن اور مذہبی آزادی حاصل کرنے کو خاص خاص صورتوں میں اسلام تلوار پکڑنے کی اجازت دیتا ہے۔ اور اسکا نام جہاد رکھا ہے۔ لیکن اس میں کوئی ایسی لڑائی داخل نہیں ہے جو کسی ملکی یا دنیوی غرض سے کی جائے۔

پس جس ملک میں مسلمان اس حالت میں رہتے ہوں کہ ایک غیر مسلم حکومت کی رعایا ہوں اور ان کو امن دیا گیا ہو۔ اور ان کے جان و مال کی حفاظت کی جاتی ہو اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت ہو تو اس سے صریحًا ان کے اور اُس حکومت کے درمیان ایک معاہدہ قائم ہو جاتا ہے کہ وہ اس سلطنت کی تابعداری کریں گے اور اپنی جانب سے اس کی حفاظت اور حمایت کریں گے۔ اور اسلام معاہدات کے پورا کرنے اور غدر و نقض عہد نہ کرنے کی نہایت سخت تاکید کرتا ہے۔

سورہ بقر (ع ۲۲) میں خداوند تعالےٰ پرہیزگاروں کی صفات میں اَلْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا "جب (کسی بات کا) اقرار کرلیا تو اپنے قول کے پورے"۔ فرماتا ہے۔ پھر ایک مقام پر (سورہ مائدہ) میں فرماتا ہے یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ "مسلمانو! اپنے اقراروں کو پورا کرو"۔ پھر فرماتا ہے (سورہ بنی اسرائیل) وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا "اور عہد کو پورا کیا کرو کیونکہ (قیامت میں عہد کی بازپرس ہوگی"۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال اور افعال سے پابندی عہد کے التزام پر جس قدر زور دیا ہے۔ اس سے بہتر سبق آمیز کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ جناب اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے بدعہدی کو نفاق فرمایا ہے اور فرمایا ہے لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ "جس میں ایفائے عہد کی صفت نہ ہو اسکا کچھ دین نہیں"۔ مسلمانوں کو جو حکم اپنے دینی بھائیوں کو ان کی مذہبی اغراض کی خاطر مدد دینے کا دیا گیا ہے وہ بھی بعض حالتوں میں مشروط ہے اور ایک حالت میں معاہدہ کی عظمت اور رعایت کا بہت بڑا پاس اور لحاظ کرنیکا حکم دیا گیا ہے (سورہ انفال۔ ع ۹) وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ۔ "اگر تم سے مذہبی معاملہ میں امداد طلب کریں تو مدد کرنا تم پر لازم ہے۔ لیکن اس گروہ کے برخلاف نہیں جس سے اور تمہارے مابین معاہدہ ہے"۔

شریعت اسلام شائستہ ترین قانون اور اخلاق کی تعلیم کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ وہ بآواز بلند یہ سکھلاتی ہے کہ تمہارے ساتھ جو احسان کرے اُسکے ساتھ احسان کرو جو نیکی کرے اُس کے ساتھ نیکی کرو۔ اور احسان اور نیکی کا شکر ادا کرو۔ هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ "احسان کا بدلہ سوائے احسان کے اور کیا ہوسکتا ہے"۔ مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ "جو انسان کا شکر نہیں کرتا وہ خدا کا ناشکرا ہے"۔ احسان کا شکر کرنیکی ایک عظیم الشان مثال بانی اسلام علیہ التحیات والسلام نے قائم فرمائی ہے کہ خود مسلمان اس پر حیرت زدہ ہوکر رہ جاتے ہیں۔ جناب رسول اکرمؐ نے جب دین اسلام کی منادی شروع فرمائی تو جیسا کہ ضروری تھا قریش نہایت برہم اور ناراض ہوئے کیونکہ توحید کی تلقین سے ان کے آبائی مذہب یعنی بت پرستی کی توہین اور تذلیل کی جاتی تھی۔

جناب رسالت مآبؐ کو تو کسی حد تک اپنے چچا ابو طالب کی حمایت اور حفاظت حاصل تھی اور قریش ان کا کچھ بگاڑ نہ سکے لیکن جب اور لوگ اسلام قبول کرنے لگے تو قریش اور دوسرے قبیلوں نے ان کو سخت سے سخت ایذائیں پہونچانی شروع کیں جو ناقابل برداشت تھیں۔ چونکہ آنحضرتؐ ان کی حفاظت کرنے کی توفیق نہیں رکھتے تھے اور ان مظلوم مسلمانوں کی دردناک حالت بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ آپ نے ان کو یہ صلاح دی کہ ترک وطن کریں اور افریقہ کی ریاست حبشہ کے نیک نام عیسائی بادشاہ نجاشی کے ملک میں چلے جائیں۔ چنانچہ پہلی دفعہ گیارہ مردوں اور چار عورتوں نے حبشہ میں جاکر پناہ لی۔ یہ پہلی ہجرت کہلاتی ہے۔ اس کے بعد جوں جوں لوگ مسلمان ہوتے گئے یا کفار کے ہاتھوں سے ایذائیں برداشت نہ کر سکے حبشہ ہی میں جاکر پناہ گزیں ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کے علاوہ بیاسی ۸۲ مہاجرین وہاں جمع ہو گئے۔ قریش نے ان کو وہاں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا اور نجاشی کے پاس پہونچکر اس کو اُن عاجز مسلمانوں کے برخلاف بھڑکایا کہ یہ بے دین ہیں اور تمہارے ملک میں فساد برپا کرنے کی غرض سے آئے ہیں اور تمہارے پیغمبر حضرت عیسٰیؑ کو بھی برا کہتے ہیں۔ ان کو ملک سے نکال دینا چاہئے۔ نجاشی نے اس شکایت پر تمام مسلمانوں کو اپنے سامنے بلایا اور اُن الزامات کی بابت جو قریش نے ان پر لگائے تھے ان سے جواب طلب کیا۔ حضرت جعفر طیار بن ابی طالب نے جو آنحضرتؐ کے چچازاد بھائی تھے اور اس گروہ میں شامل تھے سب مسلمانوں کی طرف سے وکالتاً گفت وگو کی اور اپنے پیغمبرؐ کی اور اپنی سرگذشت بیان کی اور قریش کے ظلم وستم کا حال بیان کیا اور قرآن مجید کی بعض سورتیں اور خاصکر سورۂ مریم پڑھ کر سنائی جن کو سُنکر نجاشی اور اُس کے درباری اسقدر متاثر ہوئے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ان کو معلوم ہو گیا کہ قریش محض دشمنی کی وجہ سے اور ان لوگوں کی تخریب کی غرض سے جھوٹی شکایتیں کر رہے ہیں اور مسلمان بجائے حضرت عیسٰےؑ کو بُرا کہنے کے ان کو خدا کا نبی اور مرسل مانتے ہیں تو نجاشی نے قریش کو ایک روکھا سا جواب دے دیا اور کہا کہ مسلمانوں کو پناہ دینا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے اور اُن کو اپنی پناہ سے محروم نہیں کرے گا۔ چنانچہ قریش اپنا سا مُنہ لے کر وہاں سے لوٹ آئے اور وہ مسلمان جب تک کہ وہ مدینہ نہیں گئے وہیں مقیم رہے۔ نجاشی نے مسلمانوں پر یہ بہت بڑا

احسان کیا تھا اور اب دیکھنا چاہئے کہ ہمارے نبی کریمؐ نے اس احسان کا اعتراف کس طریق سے کیا۔ اسکی کیفیت بخاری کی دو حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے۔

عن جابرؓ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین مات النجاشی مات الیوم رجل صالح فقوموا فصلوا علی اخیکم (بخاری)

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جب نجاشی کا انتقال ہوا یعنی اسکے انتقال کی خبر آئی تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج ایک نیک آدمی مرگیا ہے۔ لوگو کھڑے ہو اور اپنے بھائی کی نماز جنازہ پڑھو۔

عن جابر ابن عبد اللہ الانصاری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلے علی اصحمۃ النجاشی فصففنا وراءہ فکنت فی الصف الثانی او الثالث (بخاری)

حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری سے روایت ہے کہ جناب نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اصحمہ نجاشی کے جنازے کی نماز پڑھی تو ہم لوگوں نے آپ کے پیچھے صف باندھی۔ میں دوسری صف میں تھا یا تیسری میں۔

اسلام کی تاریخ میں یہ اکیلا اور تنہا واقعہ ہے کہ ایک عیسائی کی نماز جنازہ مسلمانوں نے اور وہ بھی خود جناب رسول کریمؐ نے پڑھی ہو۔ چونکہ کسی غیر مسلم کی نماز جنازہ پڑھنے کا شرع اسلام میں حکم نہیں ہے۔ اور بجز اس ایک واقعہ کے کبھی پڑھی نہیں گئی ہے تو مسلمان علما کو اس خبر نے بڑی اُلجھن میں ڈال دیا ہے اور توجیہات کی تلاش کرنے کی ضرورت پڑی ہے۔ اور آخر اُنھوں نے اس کا حل اس طرح پر کیا ہے کہ نجاشی مسلمان ہو گیا تھا۔ لیکن تاریخی اعتبار سے نجاشی کے مسلمان ہونے کا مطلق کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اور اس بیان کی تردید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ریاست حبشہ کے فرمانروا ابتک عیسائی موجود ہیں۔

درحقیقت اس واقعہ کی تشریح نہایت ہی آسان ہے اور وہ مذہب اسلام کی فیاضی اور احسان شناسی کی تعلیم ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مبارک فعل سے عیاں اور نمایاں ہے۔ نجاشی نے جو احسان اور مروّت کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اسکا مقتضا ہی یہی تھا کہ اسلام کی طرف سے اسکے ساتھ ایسی ہی الفت اور یگانگت کا برتاؤ کیا جاتا۔ اور اسکی خدمت کا صلہ دینے کا یہی ایک ممکن طریقہ اس وقت ہو سکتا تھا۔ اس کو کوئی مال یا ملک دینے کو نہیں تھا۔ مسلمان اسکی

بھلائی کے لئے صرف دعا ہی کر سکتے تھے اور وہ کی گئی۔ وہ دعا کس درجہ تک مقبول ہوئی اسکا اندازہ خود اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ حبشہ اس وقت تک ایک اکیلی عیسائی ریاست اس تمام سرزمین میں موجود پائی جاتی ہے

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے لئے محبت اور خدا کی رحمت کا پیغام لے کر آئے تھے اور خدا نے خود پیغمبر بنایا تھا۔

وما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین

اسلام دنیا کے لئے خدا کی سراسر رحمت تھی۔ اس کا مدعا صرف یہ تھا کہ تمام خدا کے بندے خدائے واحد کے سچے بندے بن کر آپس میں سب بھائی بھائی ہو جائیں۔ اور یہ اخوت اور بھائی بندی کا تعلق تمام مغائرتوں اور جھگڑوں اور فسادوں کو مٹا کر اور انکی بیخ کنی کر کے خدا کی دنیا اور اسکی تمام مخلوق کو محبت اور امن سے مامور اور محفوظ کر دے۔ اگر مسلمانوں سے اس غایت میں کوتاہی ہوئی ہے تو اسکی جواب دہی اسلام کے ذمہ نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے ایسے افعال کے ذمہ ہے جن کو اسلام نہیں قبول کرتا ہے۔ مذہب اسلام کے سر ایک بڑا اعتراض یہ تھوپا جاتا ہے کہ وہ خونریزی کی تعلیم دیتا ہے اور اسلام دنیا میں تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے۔ لیکن ماہرین اسلام اور حقیقت شناس لوگوں کی رائے میں یہ اعتراض بالکل بے بنیاد ہے۔[1] یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے ہاتھوں سے خونریزی ہوئی۔ لیکن یہ اُن مسلمانوں کے اپنے فعل ہیں نہ کہ یہ تعلیم اسلام کا نتیجہ ہے۔ اگر مسلمانوں کے ان افعال کا اسلام ذمہ دار ہے تو عیسائیوں کے ہاتھوں سے جو اس سے بھی بڑھ کر خونریزیاں ہوئی ہیں ان کا ذمہ دار مذہب عیسوی کو قرار دینا چاہیئے۔ اور یہ کہنا جائز ہوگا کہ عیسائیت خونریزی کی تعلیم دیتی ہے۔ لیکن جیسے یہ امر نادرست ہے ایسی ہی یہ بات بھی غلط ہے کہ اسلام خون ریزی کی تعلیم دیتا ہے۔

ہم کو کہا جاتا ہے کہ مذہب اسلام کا مسئلہ جہاد ہمارے ان تمام دعاوی کے خلاف ہے اور اسکا نگل جانا ہمارے لئے بہت دشوار ہوگا۔ لیکن مولوی چراغ علی اور دیگر علما نے

[1] مسٹر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ نے اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" میں اس مسئلہ پر جس وسیع تحقیقات سے لکھا ہے اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا اور متلاشیان حق کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

علاوہ سر سید احمد خان نے مسئلہ جہاد کی حقیقت کو ایسا صاف اور واضح کر دیا ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد یہ فقرہ کسی مسلمان یا غیر مسلم کے مونھ سے اگر وہ انصاف کرنے کی طرف مائل ہو نہیں نکل سکتا۔ مسئلہ جہاد ہمارے زیر بحث مضمون سے چنداں تعلق نہیں رکھتا اور اسکی نسبت تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کا یہ کوئی محل نہیں ہے لیکن ناظرین کی اجازت سے میں سر سید احمد خان کی بحث کا ایک مختصر خلاصہ اس مقام پر لکھتا ہوں۔ اس امید سے کہ اسکا مطالعہ مسلمانوں اور خصوصاً غیر مسلمانوں کی واقفیت کے لئے نہایت مفید ہوگا۔

سر سیّد نے سورہ بقر کی ان آیتوں کی تفسیر میں جن میں مشرکین مکہ سے قتال کرنے کا حکم ہے اجمالی طور پر جہاد کے متعلق ایک لطیف تقریر لکھی ہے جسکا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"اکثر لوگ اسلام پر طعن کرتے ہیں کہ اس میں تحمل اور بردباری اور مذہب کے سبب سے جو تکلیفیں کافروں سے پہنچیں ان کی صبر کے ساتھ برداشت کی تعلیم نہیں ہے اور یہ باتیں مذہب کی سچائی اور نیکی اور اخلاق کے برخلاف ہیں۔ مگر یہ ایک بڑی غلطی اور ناسمجھی ہے۔ بے شک قران مجید میں جو لڑائی کے احکام نہایت نیکی اور انصاف پر مبنی تھے ان کو مسلمان بادشاہوں نے دینداری کے بہانہ سے اپنی خواہش نفسانی کے پورا کرنے اور ملک گیری کے لئے نہایت بد اخلاقی اور ناانصافی سے برتا۔ اور وحشی درندوں سے بھی بدتر کام کئے اور علمائے اسلام نے ان کی تائید کے لئے ایسے مسئلے بیان کئے جو اسلام کی روحانی نیکی کے برخلاف تھے۔ مگر ان کے ایسا کرنے سے جو برائی قرار دی جائے وہ انہیں پر محدود ہے جنہوں نے ایسا کیا نہ اسلام پر۔

"اسلام میں اگرچہ جا بجا صبر و تحمل کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور ان پر رغبت دلائی گئی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ بدلا لینے کی بھی بغیر زیادتی کے اجازت دی ہے۔ کیا یہ قانون دنیا کے پیدا کرنے والے کے قانون قدرت سے مناسب نہیں ہے اور کیا اس قانون سے زیادہ عمدہ اور سچا کوئی قانون ہو سکتا ہے۔ انسان جب اخلاق کی باتوں پر گفتگو کرتا ہے تو بہت سی ایسی باتیں اور ایسے اصول بیان کرتا ہے جو کان کو اور دل کو نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں اور سننے اور پڑھنے والے خیال کرتے ہیں کہ یہی اصول اخلاق کے

اور یہی اصول اعلیٰ درجہ کی نیکی کے ہیں مگر وہ درحقیقت ہوا کی آواز سے زیادہ کچھ مرتبہ نہیں رکھتے اور چونکہ وہ اصول فطرت انسانی بلکہ قانون قدرت کے برخلاف ہوتے ہیں کبھی ان پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا۔

"کوئی کتاب دنیا میں انجیل سے زیادہ انسان کو نرم مزاج اور بردبار و متحمل کرنے والی اور اخلاق کو ایسی چمک سے دکھلانے والی جس سے آنکھوں میں چکاچوند آجاوے نہیں ہے مگر ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ان کا لوگوں میں کیا اثر ہوا تھا۔ انجیل میں لکھا ہے کہ "اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اسکے سامنے کر دے"۔ بلاشبہ یہ مسئلہ اخلاق کے خیال سے تو بڑا عمدہ معلوم ہوتا ہے مگر کسی زمانہ کے لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے۔ اگر دنیا اس پر عمل کرے تو دنیا کا کیا حال ہو۔ اسیطرح آباد رہے اور اسیطرح لوگوں کی جان اور مال امن میں رہے۔ نہایت دلچسپ جواب دیا جاتا ہے کہ جب سب ایسے ہی ہو جائیں تو دنیا سے شر اُٹھ جائے۔ مگر پوچھا جاتا ہے کہ کبھی ایسا ہوا ہے؟ یا کبھی ہوگا؟ یہ سب ناشدنی باتیں ہیں جو خیال میں شدنی قرار دے کر انسان خیالی اور جھوٹی خوشی حاصل کرتا ہے"۔

"عیسائی مذہب جسکی جڑ ایسی نیکی اور نرمی اور اخلاق میں لگائی گئی تھی وہ پھولا اور پھلا اور سرسبز اور شاداب ہوا۔ اسکو چھوڑ دو کہ وہ کس سبب سے بڑھا اور سرسبز ہوا مگر دیکھو کہ اس نے کیا پھل پیدا کیا ایک بھی نصیحت اس کی کام نہ آئی۔ اور خود مذہب نے جو خونریزی اور بے رحمی اور ناانصافی اور درندوں سے بھی زیادہ بدتر خصلت دکھائی وہ شاید دنیا میں بے مثل ہوگی۔ اور جس نیکی میں اسکی جڑ لگائی گئی تھی اس نے کچھ پھل نہیں دیا۔ کیونکہ قانون قدرت کے برخلاف لگائی گئی تھی۔ جو خوبی کیا روحانی اور کیا اخلاقی اور کیا تمدنی اب ہم بعض عیسائی ملکوں میں دیکھتے ہیں کیا یہ پھل اسی درخت کا ہے جسکی جڑ ایسی نیکی پر لگائی گئی تھی جو خلاف قانون قدرت تھی۔ حاشا وکلا بلکہ یہ اسکا پھل ہے کہ اس درخت کو وہاں سے اُکھیڑ کر دوسری زمین پر لگایا ہے جو قانون قدرت کی زمین ہے اور جسقدر کہ پہلی زمین کی مٹی اسکی جڑ میں لگی ہوئی ہے اسی قدر اس میں نقصان ہے"۔

"اس سے بھی زیادہ رحیم مذہب کا حال سنو۔ جس نے ایک چھوٹے سے چھوٹے جانور کی جان کو بھی مارنا سخت گناہ قرار دیا ہے۔ خون کا بہانا آدمی کا ہو یا درندے کا یا ایک پشہ کا۔ خدا کی صنعت کو ضائع کرنا سمجھا ہے۔ مگر تاریخ اور زمانہ موجود ہے۔ اس اصول نے جو قانون قدرت کے مخالف تھا کیا نتیجہ دیا۔ قتل و خونریزی ویسی ہی رہی اور ویسی ہی ہے جیسی کہ قانون قدرت سے ہونی چاہیے۔ وہی جو ایک پشہ کا مارنا گناہ عظیم سمجھتے تھے ہزاروں آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتے تھے اور قتل کرتے ہیں۔ پس کوئی قانون

گو وہ ظاہر میں کیسا ہی چمکیلا اور خوش آئند ہو جبکہ وہ قانون قدرت کے برخلاف ہے محض نکما اور بے اثر ہے"۔

اسلام میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اُس کے تمام قانون قانونِ قدرت کے مطابق عملدرآمد کے لائق ہیں۔ رحم کی جگہ جہاں تک کہ قانونِ قدرت اجازت دیتا ہے رحم ہے معافی کی جگہ معافی ہے۔ بدلے کی جگہ بدلا ہے۔ لڑائی کی جگہ لڑائی ہے۔ ملاپ کی جگہ ملاپ ہے۔ اور یہی بڑی دلیل اسکی سچائی کی اور قانونِ قدرت کے بنانے والے کیطرف سے ہونے کی ہے"۔

"اسلام فساد اور دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔ جس نے ان کو (یعنی مسلمانوں کو) اُمن دیا ہو مسلمان ہو یا کافر۔ اس کی اطاعت اور احسانمندی کی ہدایت کرتا ہے۔ کافروں کے ساتھ جو عہد و اقرار ہوئے ہوں اُن کو نہایت ایمانداری کے ساتھ پورا کرنیکی تاکید کرتا ہے۔ خود کسی پر ملک گیری اور فتوحات حاصل کرنے کو فوجکشی اور خونریزی کی اجازت نہیں دیتا۔ کسی قوم یا ملک کو اس غرض سے کہ اسمیں بالجبر اسلام پھیلایا جائے حملہ کر کے مغلوب و مجبور کرنا پسند نہیں کرتا یہاں تک کہ کسی ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا۔ صرف دو صورتوں میں اس نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ ایک اس حالت میں جبکہ کافر اسلام کی عداوت سے اور اسلام کو معدوم کرنے کی غرض سے نہ کسی ملکی اغراض سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوں۔ کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں۔ خواہ مسلمان مسلمانوں میں اور خواہ مسلمان اور کافروں میں وہ دنیاوی بات ہے۔ اس کو مذہب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ دوسرے جب اس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں ان کی جان و مال کو امن نہ ملے۔ اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو۔ مگر اس حالت میں بھی بتایا ہے کہ جو لوگ اس ملک میں بطور رعیت کے رہتے ہیں گو صرف بوجہ اسلام کے ان پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ یا اس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں۔ یعنی اس ملک کو چھوڑ کر چلے جاویں۔ ہاں جو لوگ خودمختار ہیں اور اس ملک میں امن لئے ہوئے یا بطور رعیت کے نہیں ہیں بلکہ دوسرے ملک کے باشندے ہیں ان کو ان مظلوم مسلمانوں کے بچانے کو جن پر صرف اسلام کی وجہ سے ظلم ہوتا ہے یا ان کے لئے امن اور مذہبی آزادی حاصل کرنے کو تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے

لیکن جس وقت کوئی ملکی یا دنیوی غرض اس لڑائی کا باعث ہو اس کو مذہب کی طرف نسبت کرنے کی کسی طرح اسلام اجازت نہیں دیتا۔"

"یہی وجہ ہے جس پر اسلام نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ یہی لڑائی ہے جس کا نام جہاد رکھا ہے۔ یہی لڑائی ہے جسکے مقتولوں کو روحانی ثواب کا وعدہ دیا ہے یہی لڑائی ہے جسکے لڑنے والوں کی فضیلتیں بیان ہوئی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کی لڑائی ناانصافی اور زیادتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی اخلاق کے برخلاف ہے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی قانون قدرت اور انسانی فطرت کے مخالف ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس لڑائی کا حکم خدا کی مرضی کے برخلاف ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس حالت میں بھی لڑائی کا حکم نہ ہوتا بلکہ دوسرا گال پھیر دینا خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا۔"

"لڑائی شروع ہونے کے بعد تلوار ہر ایک کی دوست ہوتی ہے۔ اس میں بجز اس کے کہ دشمنوں کو قتل کرو۔ لڑائی میں بہادری کرو۔ دل کو مضبوط رکھو۔ میدان میں ثابت قدم رہو۔ فتح کرو یا مارے جاؤ۔ اور کچھ نہیں کہا جاتا۔ وہی قرآن نے بھی کہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اس موقع اور محل کو جسکی نسبت قرآن میں لڑنے والوں کے دلوں کے مضبوط کرنے کی آیتیں نازل ہوئی ہیں چھوڑ کر ان آیتوں کو عموماً خونخواری اور خونریزی سے منسوب کرے جیسا کہ اکثر نادان عیسائیوں نے کیا ہے تو یہ خود اسکا قصور ہوگا نہ اسلام کا۔"

"لڑائی میں بھی جو رحم قانون قدرت کے موافق ضرور ہے اسلام نے اس میں بھی فروگذاشت نہیں کیا۔ عورتوں کو۔ بچوں کو۔ بوڑھوں کو اور جو لڑائی میں شریک نہ ہوئے ہوں ان کو قتل کرنے کی ممانعت کی۔ عین لڑائی میں اور صف جنگ میں جو مغلوب ہو جائے اسکے قتل کی اجازت نہیں دی۔ صلح کو اور معاہدہ امن کو قبول کرنے کی رغبت دلائی۔ باغ کو کھیتوں کو جلانے کی ممانعت کی۔ قیدیوں کو احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ نہایت ظالمانہ طریقہ جو لڑائی کے قیدیوں کو عورت ہوں یا مرد۔ غلام اور لونڈی بنا لینے کا تھا اس کو معدوم کیا۔ اس سے زیادہ لڑائی کی حالت میں انصاف اور رحم کیا ہو سکتا ہے ہاں یہ سچ ہے کہ مسلمانوں نے اس میں سے کسی کی بھی پوری تعمیل نہیں کی۔ بلکہ برخلاف اس کے بے انتہا ظلم و ستم کیے۔ مگر جبکہ وہ اسلام کے حکم کے برخلاف تھے تو اسلام کو اس سے داغ نہیں لگ سکتا۔ وہ بھی تو مسلمانوں ہی میں سے تھے جنہوں نے عربی کو

عثمان رضہ کو۔ علی رضہ کو اور حسین رضہ کو ذبح کر ڈالا تھا۔ کعبہ کو جلا دیا تھا۔ پس ان کے کردار سے اسلام کو کیا تعلق ہے ؟"

"مشرکین مکہ نے ان لوگوں پر جو مسلمان ہو گئے تھے صرف اسلام کی عداوت سے اور خود رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم پر بہت سے ظلم کیئے تھے اور تکلیفیں پہونچائی تھیں۔ قتل کے درپے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ مسلمانوں نے حبشہ میں جاکر پناہ لی اور آخر کار آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے آئے۔ پھر انہوں نے وہاں بھی تعاقب کرنا چاہا۔ اور مکہ میں حج کے لیئے آنے سے روکا لڑائی پر آمادہ ہوے۔ تب اسلام نے ان سے لڑنے کا حکم دیا۔ پس جس قدر احکام قتل مشرکین کے ہیں وہ سب انہیں لڑنے والوں سے متعلق ہیں۔ وہ بھی اسی وقت تک کہ فتنہ و فساد رفع ہو جاوے جیسے کہ خود خدا نے فرمایا ہے وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۔ امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ مشرکین کا فتنہ یہ تھا کہ وہ مکہ میں مسلمانوں کو مارتے تھے اور ایذا دیتے تھے۔ یہاں تک کہ تنگ ہو کر مسلمان حبشہ کو چلے گئے پھر بھی وہ برابر ایذا اور تکلیف دیتے رہے یہاں تک کہ مسلمان مدینہ میں ہجرت کر گئے۔ اور مشرکین کی غرض ایذاؤں اور تکلیفوں سے یہ تھی کہ مسلمان اپنا اسلام چھوڑ کر پھر کافر ہو جائیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اسکے معنے یہ ہیں کہ "کافروں سے لڑو جب تک کہ اُن پر غالب ہو جاؤ تاکہ وہ تم کو تمہارے دین سے پھیرنے کے لیئے ایذا نہ دے سکیں۔ اور تم شرک میں نہ پڑو" يَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ کا فقرہ بھی انہی آیتوں کے ساتھ ہے جو مشرکین عرب کے حملہ کے دفع کرنے کو لڑنے کی بابت نازل ہوئی تھیں۔ اسکے یہ معنے سمجھنے کہ اتنا لڑنا چاہیئے کہ اسلام کے سوا کوئی دین نہ رہے۔ یہ تو محض نادانی کی بات ہے جو سلف سے آج تک نہ کبھی ہوئی اور نہ ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔ اسکے معنے صاف صاف یہ ہیں کہ اسقدر لڑنا چاہیئے کہ اللہ کے دین کے بجا لانے میں جو کافر حرج ڈالتے ہیں وہ نہ ہیں اور اللہ کے لیئے دین ہو جائے کہ مسلمان خدا کے لیئے اسکو بے ایذا بجا لاسکیں۔"

سید نے سورہ بقر کی تفسیر میں مسئلہ جہاد کے متعلق صرف اسی اجمالی بیان پر اکتفا کیا ہے۔ مگر سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کی تفسیر میں اس بحث کو نئے سرے سے بہت بڑے استمداد کے ساتھ اٹھایا ہے۔ اور اپنی تفسیر کی چوتھی جلد قریب نصف کے اس

مسئلہ کی تحقیقات پر لکھی ہے۔

انہوں نے سورۂ توبہ کی تفسیر میں اول بطور الزامی حجت کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑائیوں کا مقابلہ حضرت موسےٰؑ کے قتل و غارت سے جو کہ توریت میں مذکور ہے کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑائیاں اسکے مقابلہ میں بالکل رحمت تھیں۔ اور جو لوگ توریت کو اور حضرت موسےٰؑ کو مانتے ہیں انکے لئے حضرت مسیحؑ کا یہ قول کافی ہے کہ "تو اس تنکے کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے کیوں دیکھتا ہے اور جو شہتیر تیری آنکھ میں ہے اُسے دریافت نہیں کرتا"۔ اسکے بعد وہ لکھتے ہیں "مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم صرف حجت الزامی پر اکتفا کریں۔ بلکہ ہمارا مقصود ہر امر کی تحقیق کرنا اور اسکی اصلیت کو ظاہر کرنا ہے۔ اسلئے ہم اس امر کو بخوبی تحقیق کرنا چاہتے ہیں"۔

اس کے بعد اُنھوں نے ان تمام اعتراضات کو جو قدیم سے مخالفین اسلام کے مسئلہ جہاد پر کرتے چلے آئے ہیں لبّ لباب بیان کر کے اس بات کا دعوےٰ کیا ہے کہ تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہوئیں ان سے صرف امن قائم رکھنا اور کفّار کے شر سے اسلام اور اہل اسلام کو بچانا مقصود تھا۔ نہ کہ زبردستی ہتھیاروں کے زور سے جیساکہ عیسائی کہتے ہیں اسلام منوانا اور اسکے ثبوت میں اول اُن تمام واقعات کی تفصیل بیان کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرہ برس تک برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے مکّہ معظمہ میں قریش کے ہاتھوں سے کیسی کیسی سختیاں اور ظلم و ستم برداشت کئے اور کیا مصیبتیں جھیلیں اور کس بیم و ہراس کی حالت میں یہ زمانہ اسلام اور بانی اسلام پر گذرا۔ یہاں تک کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شفیق چچا ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو دین اسلام کے معدوم کرنے یعنی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا نہایت پختہ طور سے منصوبہ باندھا گیا۔ دو دفعہ انہی سختیوں اور ظلم و ستم سے تنگ آکر بہت سے مسلمان مرد، عورتیں ہجرت کر کے حبشہ کو چلے گئے۔ اور آخرکار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور تمام مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے وطن مالوف چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ قریش نے ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کے آزار پہونچانے میں کمی نہیں کی۔ حبشہ کے مہاجروں کا تعاقب انہوں نے سمندر کے کنارہ تک کیا اور جب وہ ہاتھ نہ آئے تو نجاشی کے پاس بہت سے تحفے اور ہدیے

بھیجکر مسلمانوں کو اس سے مانگا۔ مگر نجاشی نے ان کے دینے سے انکار کیا۔ اہل مدینہ کے ساتھ بھی جنہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نصرت کا وعدہ کیا تھا۔ یا جو مکہ سے ہجرت کر کے وہاں آئے تھے قریش نے برائی کرنے میں کچھ کمی نہیں کی۔ اور مدینہ پر بھی قریش کے حملہ کرنیکا برابر خطرہ لگا رہا۔

جبکہ اسلام اور اہل اسلام کی یہ حالت تھی تو سرسید لکھتے ہیں کہ "ایسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مہاجرین و انصار کو اپنی اور مدینہ کی حفاظت اور امن قائم رکھنے کے لئے چار امر لازمی تھے کہ بغیر ان کے کبھی امن اور مطلوبہ حفاظت کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی تھی۔

(۱) اس بات کی خبر رکھنی کہ قریش مکہ کیا کرتے ہیں اور کس منصوبہ میں ہیں۔

(۲) جو قومیں کہ مدینہ یا نواح مدینہ میں رہتی تھیں اُن سے امن کا اور قریش کی مدد نہ کرنے کا معاہدہ کرنا لیکن عہد شکنی کی حالت میں ان سے مقابلہ کرنا۔ اس منصوبہ کے لئے ایسا ہی ضروری تھا جیسا کہ امن کا معاہدہ کرنا۔ کیونکہ اگر عہد شکنی کی مکافات قائم نہ کیجاوے تو کوئی معاہد اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکتا اور امن مطلوبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۳) جو مسلمان کہ مکہ میں مجبوری رُک گئے تھے اور موقعہ پا کر وہاں سے بھاگ آنا چاہتے تھے انکے بھاگ آنے پر جسقدر ہو سکے انکی اعانت کرنا۔ چنانچہ جو قافلہ مکہ سے نکلتا تھا ہمیشہ احتمال ہوتا تھا کہ شاید اسکے ساتھ بہانہ کر کے کوئی مسلمان مدینہ کی طرف بھاگنے کے ارادہ سے نہ نکلا ہو۔

(۴) جو گروہ قریش کا مکہ سے مدینہ پر حملہ کرنے کو نکلے یا کسی طرح پر احتمال ہو کہ وہ مدینہ پر آنے والا ہے اسکا ہتھیاروں سے مقابلہ کرنا۔ کیونکہ ایسا کرنا امن کے قائم رکھنے کے لئے لازمی اور ضروری ہے۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ان سوا دو امر اور ہیں جو ہتھیاروں کے اُٹھانے کے باعث ہوتے ہیں۔

(۱) یہ کہ کفار ان مسلمانوں کو جو ان کے قبضہ میں ہوں تکلیف اور ایذا دیتے ہوں اور انکی مخلصی کے لئے لڑائی کی جاوے۔ کون شخص ہے جو اس لڑائی کو انسانی اخلاق اور انسانی نیکی کے برخلاف کہہ سکتا ہے۔ اور یہ اتہام کر سکتا ہے کہ وہ زبردستی

اور ہتھیاروں کے زور سے مذہب قبلوانے کے لئے ہے۔

(۲) یہ کہ کفار مسلمانوں کو ان کے احکام مذہبی ادا کرنے کے لئے مانع ہوں۔ بشرطیکہ وہ ان کی عملداری میں رہتے نہ ہوں۔ کیونکہ اس صورت میں ان کو وہاں سے ہجرت کرنی لازم ہے نہ لڑائی۔ اگرچہ اس لڑائی کی بنیاد ایک مذہبی امر پر ہے لیکن اسکا مقصد اپنی مذہبی آزادی حاصل کرنا ہے نہ کہ دوسروں کو ہتھیاروں کے زور سے مذہب کا منوانا۔"

پھر لکھتے ہیں کہ ایک اور امر ہے جو انہی قسموں کی لڑائیوں کا ضمیمہ ہے۔ یعنی جس ملک یا قوم سے انہی امور (یعنی مذہبی امور) کے سبب مخالفت ہے اور لڑائی مشتہر ہو چکی ہے۔ اس ملک یا قوم پر چھاپہ مارنا یا ان کا اسباب اور ان کی رسد اور ان کے ہتھیاروں کو لوٹ لینا اس زمانہ تہذیب میں بھی کونسی مہذب سے مہذب قوم ہے جو اس فعل کو نامہذب و ناجائز قرار دے سکتی ہے۔ اور کون ہے جو اس کو ہتھیاروں کے زور سے مذہب قبلوانا قرار دے سکتا ہے۔ تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئیں وہ انہی امور پر مبنی تھیں۔ ایک لڑائی بھی اس غرض سے نہیں ہوئی کہ مخالفوں کو زبردستی اور ہتھیاروں کے زور سے اسلام منوایا جائے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس دعوے کا ثبوت دو طرح پر ہو سکتا ہے۔ اول اُن احکام سے جو قرآن مجید میں لڑائیوں کی نسبت وارد ہیں اور جنسے ظاہر ہوگا کہ لڑائی کا حکم صرف امن قائم کرنے کے لئے تھا نہ زبردستی سے اسلام قبلوانے کے لئے۔ دوسرے ان لڑائیوں کے واقعات پر غور کرنے سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں واقع ہوئیں۔ اس کے بعد ایک امر اور بحث طلب باقی رہ جائے گا (یعنی یہ) کہ ایک پیغمبر کو اس قسم کی لڑائیاں لڑنا بھی زیبا ہے یا خموشی سے گردن کٹوا کر اور سر کو طشت میں رکھوا کر دشمن کے سامنے جانے دینا۔ یا کافروں کے ہاتھوں میں اپنے تئیں ڈلوا کر صلیب پر چڑھنا اور جان دینا۔ سو ہم اس پر بھی آخر کو بحث کرینگے۔"

اس کے بعد انھوں نے نہایت تشدد و مد سے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کی کسی آیت میں جبراً مسلمان کرنے کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ مسلمان کرنے کے لئے صرف وعظ اور نصیحت کرنے کی ہدایت ہے۔ پھر وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں مذہب کی آزادی کا حکم ہے۔

مثلاً سورۂ نحل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ "دعوت اسلام کر حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اور ان سے بحث کر پسندیدہ طریق کے ساتھ۔"

یا سورۂ نور میں حکم ہے کہ "خدا اور رسول کی فرمانبرداری کرو اور اگر تم پھر جاؤ گے تو ہمارے رسول کے ذمہ صرف حکموں کا پہونچا دینا ہے۔" یا سورۂ ق میں فرمایا کہ "اے پیغمبر تو ان پر جبر کرنے والا نہیں ہے۔" اور سورۂ غاشیہ میں فرمایا کہ "اے پیغمبر تو صرف نصیحت کرنے والا ہے کچھ ان پر کڑوڑا نہیں ہے۔" اور سورۂ یونس میں فرمایا ہے کہ "اے پیغمبر تو ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔" اور سورۂ بقرہ میں صاف صاف فرما دیا کہ "دین میں کچھ جبر و اکراہ نہیں ہے۔"

اس کے بعد مخالفین کے اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ قرآن کی یہ نصیحتیں اس وقت تک تھیں جب تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے۔ مگر جب مدینہ میں چلے گئے اور مہاجرین و انصار ایک جگہ جمع ہو گئے اور اسلام کو قوت حاصل ہو گئی اس وقت یہ نصیحتیں بدل دی گئیں اور تلوار کے زور سے مسلمان کرنے کا حکم دیا گیا ہے پھر اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ اول تو سورۂ نور اور سورۂ بقرہ ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہیں جبکہ اسلام کو بخوبی قوت ہو گئی تھی۔ حالانکہ انہی سورتوں میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا یہ حکم ہے کہ رسول کا کام صرف حکموں کو پہونچا دینا ہے۔ اور دین میں کچھ جبر و اکراہ نہیں ہے۔ دوسرے خدا کے احکام جو بطور اصل اصول کے نازل ہوئے ہیں وہ جگہ کے بدلنے یا قوت و ضعف کے تفاوت سے تبدیل نہیں ہو سکتے۔ پس جبکہ آپ کعبہ میں تھے جب بھی اور جب مدینہ میں چلے گئے جب بھی یہی حکم تھا کہ کوئی شخص زبردستی سے مسلمان نہ کیا جائے۔ ہاں جب آپ مدینہ میں تشریف لے گئے تو بیشک لڑائی کا حکم ہوا۔ مگر نہ اسلئے کہ لوگوں کو جبراً مسلمان کیا جائے۔ بلکہ محض امن قائم کرنے کے لئے جیسا کہ آئندہ بہ تفصیل بیان کیا جائے گا۔

اس کے بعد صلح اور معاہدہ کی حالت میں جو مذہبی آزادی قرآن میں غیر مسلمین کو دی گئی ہے اس کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اور قرآن کی وہ تمام آیتیں نقل کی ہیں جن میں صلح و معاہدہ کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ پھر قرآن مجید کی وہ تمام آیتیں جن میں کفار سے لڑنے کا حکم ہے ایک ایک کر کے ذکر کی ہیں اور نہایت وضاحت اور صفائی کے ساتھ ان سے ثابت

کیا ہے کہ قرآن میں صرف تین قسم کے لوگوں سے لڑائی کا حکم ہوا ہے۔

(۱) اُن لوگوں سے جو خود مسلمانوں سے لڑائی شروع کریں۔

(۲) اُن لوگوں سے جنھوں نے دغابازی کی ہو اور معاہدوں کو توڑ دیا ہو۔

(۳) اُن لوگوں سے جنھوں نے مسلمانوں کو یا ان کے بچوں اور عورتوں کو عذاب اور تکلیف میں ڈال رکھا تھا۔ ان صورتوں کے سوائے کہیں قرآن میں لڑائی کا حکم نہیں دیا گیا۔ پھر انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی تمام لڑائیاں جو غزوہ اور سریہ کے نام سے مشہور ہیں بالاستیعاب بیان کی ہیں۔ اور سنہ ۲ھ سے سنہ ۹ھ تک ۳۱ غزوات اور ۵۲ سرایا کا مفصل حال حدیث اور سیر اور جغرافیہ کی سولہ معتبر کتابوں سے لکھا ہے اور کمال خوبی اور صفائی کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ان ۸۳ واقعات میں ایک واقع بھی ایسا نہیں ہے جو اس غرض سے کیا گیا ہو کہ لوگوں کو بجبر و بزور شمشیر مسلمان کیا جائے۔ بلکہ یہ تمام لڑائیاں اور مقابلے یا تو دشمنوں کی مدافعت اور ان کا حملہ روکنے کے لئے ہوئے تھے یا انکا ارادہ فاسد ہونیکے بعد ان کو منتشر کرنے کو یا ان کی عہد شکنی اور دغابازی ظاہر ہونے کے بعد اور یا اُن لوگوں کی مدد کے لئے جو خبر رسانی کی غرض سے بھیجے گئے تھے اور دشمنوں سے ان کا مقابلہ ہو گیا۔ اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس نے ملک کا انتظام ہاتھ میں لیا ہو اور اسکو اس قسم کی لڑائیاں نہ پیش آئی ہوں۔ پھر ان لڑائیوں کی نسبت یہ کہنا کہ زبردستی ہتھیاروں کے زور سے مسلمان کرنے کے لئے تھیں ایک ایسا غلط قول ہے جس کو کوئی ذی عقل بجز اس کے جس کے دل میں تعصب بھرا ہو قبول نہیں کر سکتا۔

پھر لکھتے ہیں کہ جس قوم کی کسی ملک میں حکومت ہو جاتی ہے قدرتی طور پر اس قوم کے نہ صرف مذہب کو بلکہ رسم و رواج و عادات و اطوار کو ترقی ہوتی ہے اور لوگ اسکی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہ مقولہ کہ "الملك والدين توامان" ہر ایک قوم ہر ایک مذہب پر صادق آتا ہے۔ اسی طرح اسلامی حکومت کے سبب اسی قدرتی قاعدہ سے اسلام کی ترقی کو بھی مدد پہونچی۔ بلکہ اسلام کی تاریخ میں ایک ایسا عجیب واقع پایا جاتا ہے جو اور کسی مذہب کی تاریخ میں نہیں ہے کہ فاتح[1] قوم نے فتح کامل حاصل

[1] یہاں فاتح قوم سے مراد خوانین تاتار ہیں جن میں سب سے زیادہ نامور چنگیز خان اور ہلاکو خان ہوئے ہیں (باقی دیکھو صفحہ ۸۱)

کرنے اور استقلال کامل پانے کے بعد اپنی مفتوح قوم (یعنے مسلمانوں) کا دفعتہً مذہب اختیار کرلیا۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بت شکنی میں (جس کو مخالفین اسلام مثل سلاطین اسلام کی بت شکنی کے قابل الزام سمجھتے ہیں) اور محمود و عالمگیر وغیرہ کی بت شکنی میں فرق بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ کعبہ میں ایک مسجد تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی خدائے واحد کی عبادت کے لئے۔ اسکے بعد جب عرب بت پرست ہو گئے تو اس مسجد میں اُنھوں نے بت رکھ دیے جنکا برباد کرنا اور دین ابراہیم کا اس مسجد میں جاری کرنا ابراہیم کے ہبلو ٹھے بیٹے کے فرزند کو لازم تھا۔ قوم عرب جسکا غالب حصہ ابراہیمؑ کی نسل سے تھا اور جس نسل میں خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی تھے اس قوم کو بتوں کی پرستش سے چھوڑانا اور ابراہیم کے خدا کی پرستش سکھلانا ضرور تھا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی قوم کے بت توڑے تھے اس سے دیگر اقوام کے مذہب کی آزادی کو ضائع کرنا لازم نہیں آتا۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں جہاں بت شکنی اور غیر مذہب کے معبودوں کے برباد کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ اسی طرح ہزاروں مثالیں اس کے برخلاف بھی موجود ہیں۔ مسلمانوں کی سلطنت دنیا کے بہت بڑے حصہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں مختلف مذہب کی قومیں رہتی تھیں۔ تمام سینگاگ اور تمام گرجے جو زیادہ تر رومن کیتھلک مذہب کے تھے بدستور قرنا اور گھنٹے بجاتے تھے۔ تمام ملک میں ناقوس کی آواز گونجتی تھی۔ مندروں میں بت موجود تھے۔ ہر ایک قوم اپنے مذہب میں آزاد تھی پس ان تمام حالات کو جو نہایت کثرت سے تھے بھول جانا اور چند واقعات کو جو کسی برخلاف شخصی طبیعت سے واقع ہوئے تھے پیش کرنا اور کہنا کہ اسلام نے مذہبی آزادی کو مٹایا تھا محض ناانصافی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صنہ) جو مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ چنانچہ چنگیز خان کا قول تھا کہ خدا تعالے نے مجھے مسلمانوں کے قلع و قمع کے واسطے بھیجا ہے۔ ان کی حکومت تمام ایران۔ توران۔ خوارزم۔ دشت قبچاق اور روس وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسی سلطنت اور حکومت کے زمانہ میں اول برکہ خان چنگیز خان کا پوتا مسلمان ہوا تھا اور پھر سلطان احمد جس کا نام اسلام سے پہلے نکودار تھا اسلام لایا۔ اور پھر رفتہ رفتہ تمام تاتاریوں میں اسلام پھیل گیا۔

اس کے بعد آنحضرتؐ کے غزوات کی نسبت لکھتے ہیں کہ تمام انبیا جب کہ قوم کی اصلاح اور ان کی درستی کو کھڑے ہوتے ہیں تو ابتدا میں عموماً ان کے دشمن چاروں طرف ہوتے ہیں۔ اگر وہ مخالفوں سے محفوظ رہنے کی کوشش نہ کرتے تو دنیا میں آج یہودی مذہب کا وجود ہوتا اور نہ اور کسی مذہب کا اور نہ عیسائی مذہب کا نام باقی رہتا۔ اگر بعد حضرت مسیح کے اسکے لئے ایسا زمانہ نہ آتا جس میں اس کے پیروؤں کی مخالفین سے حفاظت کی گئی اور بزور حکومت اس کو ترقی دی گئی۔ قرآن میں نہایت عمدہ اور سچ بات خدا تعالےٰ نے فرمائی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ

یعنے اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا تو ڈھا دی جائیں عیسائیوں اور ویشنوں کی خانقاہیں اور یہودیوں کے معبد اور مسلمانوں کی مسجدیں۔ جن میں بہت زیادہ خدا کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پس یہ کہنا کہ انبیا کو ایسی لڑائیاں نا زیبا ہیں ایک ایسا قول ہے جس کو قانون قدرت مردود ٹھہراتا ہے۔ لوگ حضرت موسےٰ کے کاموں کو تو بھول جاتے ہیں اور غریبی اور مسکینی اور مظلومی کی مثال میں حضرت مسیح کو پیش کرتے ہیں۔ مگر حضرت مسیحؑ نے جب اپنے تئیں خلقت کے سامنے پیش کیا اس وقت سے ان کی وفات تک نہایت قلیل زمانہ قریب تین برس کے گذرا تھا۔ اور صرف ستر آدمیوں کے قریب اس عرصہ میں ان پر ایمان لائے تھے۔ ان کو مطلق ایسی قوت جس سے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اور اس سبب سے کالوری کے پہاڑ پر وہ افسوسناک واقعہ (یعنے مصلوب ہونا) واقع ہوا۔ اسکے بعد اگر اسکے (یعنے دین مسیحی کے) ایسے حامی نہ پیدا ہو جاتے جو دشمنوں کو دفع کر سکے تو آج دنیا میں ایک بھی گرجا اور ایک بھی خانقاہ نہ دکھائی دیتی"۔

اگر سید احمد خان اس زمانہ میں موجود ہوتے جب کہ یورپ میں ایک نہایت ہولناک اور خونخوار قتال ہو رہا ہے تو وہ مسئلہ جہاد کی تشریح نہایت آسانی سے کر سکتے اور صرف اسقدر بتانے کی ضرورت ہوتی کہ جہاد اُس لڑائی کا نام ہے جو انگلستان اور فرانس وغیرہ جرمنی کے مقابلہ میں لڑ رہے ہیں۔ جس طرح اس وقت

انگریزوں اور فرانس وغیرہ کو اپنے ممالک اور انسانی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے ایک ظالم اور بے اصول قوم سے جس نے تہذیب اور شائستگی کے نام پر نہایت زبون دھبہ لگا دیا ہے مجبوراً جنگ کرنا پڑا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو اپنے مذہب اور ہستی کی حفاظت کے لئے کفار سے مجبوراً لڑائیاں کرنی پڑی تھیں۔ اس قسم کی لڑائیوں کی ضرورت بسا اوقات دنیا میں پیش آئے گی۔ اور ایسی لڑائیوں کو کوئی ناجائز اور خلاف تہذیب و شائستگی نہیں کہہ سکے گا۔ اور اسکے ساتھ ہی یہ امر بھی بلا تأمل مان لیا جائیگا کہ خود غرضی اور ملک گیری کی غرض سے جرمنی نے جو نوع انسان کے خون کے دریا بہا دئے ہیں اور کروڑوں مخلوق الٰہی کو اس بیجد ظالم نے فنا کرا دیا ہے اسکے واسطے کسی مذہب کو بدنام نہیں کیا جا سکتا۔

جن مسلمانوں کو خدا نے بصارت اور بصیرت دی ہے وہ اسبات کو مانتے ہیں اور جوں جوں مسلمانان عالم کی آنکھیں علم و شائستگی کی روشنی میں کھلتی جائیں گی وہ اسبات کو سمجھیں گے کہ اس وقت یورپ نے اسلام پر ایک خاص احسان کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یورپ کے علم و حکمت نے مذاہب کی صداقت کے جانچنے کے لئے ایک جدید معیار مہیا کر دیا ہے۔ اور اسلام کو اس معیار پر بھی پرکھنے کے بعد ہم اس بات کا دعوٰی کرنیکے قابل ہو گئے ہیں کہ سوائے اسلام کے اور کوئی سچا مذہب دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اور اہل یورپ جب مذاہب کی تحقیقات کی طرف متوجہ ہوں گے تو وہ بھی اس امر سے اتفاق کرینگے۔ کیونکہ ان کے پیش کردہ معیار پر اگر کوئی مذہب پورا اتر سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ سینکڑوں دیگر مسائل کی طرح جن میں غلامی اور جہاد داخل ہیں خلافت کے مسئلہ کی جانچ بھی جب اس معیار کے لحاظ سے کی گئی ہے تو اسکی اصلیت دریافت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی ہے۔ مسلمانان ہندوستان انگریزی سلطنت کی اقسام و انواع کی بیشمار برکتوں میں سے سب سے زیادہ اس احسان کی قدر کرتے ہیں جو ان پر تمام اہل ملک کے ساتھ علوم مغربی کی تعلیم کے سامان مہیا کر دینے سے اس نیک اور فیاض حکومت نے کیا ہے۔ گو اکثر مسلمانوں نے اس امر کو محسوس نہ کیا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تعلیم نے اسلام اور مسلمانوں پر ایک خاص اثر پیدا کیا ہے اور اسلام کے لئے ایک نئے عظیم الشان دَور کی ابتدا کی ہے اور بنیاد رکھی ہے۔ یعنی ہم کو اپنے پاک اور سچے مذہب کی حقیقت سے آگاہ ہونے کی طرف راہ نمائی کرنے کے علاوہ ہم میں اس امر

کی قابلیت پیدا کر دی ہے کہ ہم یورپ کی ترقی یافتہ اقوام کے سامنے اسلام کو اسکی اصلی اور خالص صورت میں اس اعتماد کے ساتھ پیش کرینگے کہ اگر اہل یورپ کی سوئی ہوئی روحانی استعدادیں بیدار ہوں۔ مادیت کے بوجھ سے دبی ہوئی روحانیت کو کسی وقت تحریک ہو۔ اور تحقیق حق کی خواہش ان کے دلوں میں بے چینی پیدا کر دے۔ تو ان کی جستجو کا موضوع ان کو اسلام کی اس شکل میں ملے گا جس کو ہم اصلی اور خالص اسلام کہتے ہیں۔

انگریزی سلطنت کے جو احسانات ہندوستان کے مسلمانوں پر ہیں ان کا اندازہ اور شمار کرنا ایک امر محال ہے۔ وہ ان احسانات سے بدرجہا زیادہ اور گراں تر ہیں جو نجاشی نے مہاجرین مکہ پر کئے تھے۔ اور یہ مسلمان خدا کے ناشکرے اور مردود بندے ہوں گے اگر ان احسانات کو فراموش کر بیٹھیں گے یا ان کا اعتراف کرنے میں قصور کرینگے۔

بعض ناواقف لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگریزوں نے مسلمانوں سے لی ہے۔ لیکن یہ خیال تاریخی واقعات کے خلاف اور بالکل غلط ہے ہندوستان کے بڑے حصہ میں جس میں دارالسلطنت دہلی بھی شامل تھا مرہٹے اپنا تسلط جما چکے تھے۔ اگر احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کو شکست دینے کے بعد دہلی پر قبضہ کر لیتا تو ممکن تھا کہ ایک اسلامی سلطنت کچھ مدت کے لئے پھر ہندوستان میں قائم ہو جاتی۔ مگر اس کے واپس چلے جانے نے میدان پھر مرہٹوں کے ہاتھ میں ہی رہنے دیا۔ پنجاب میں سکھوں کا راج خدا نے اس حکمت کی بنا پر قائم کر دیا تھا کہ مسلمان مرہٹوں اور سکھوں کی حکومت کا اس پر برکت سلطنت سے مقابلہ کر سکیں جو خدا اپنی رحمت کی شکل میں اس سرزمین کو بخشنے والا تھا۔ جو امن اور آزادی ہم کو انگریزی سلطنت میں ملی ہے وہ کسی غیر اسلامی سلطنت کی مسلمان رعایا کو نہ اس سے پہلے کبھی حاصل ہوئی ہے اور نہ اس وقت حاصل ہے بلکہ اسلامی حکومتوں میں بھی مسلمانوں کو بہت کم نصیب ہوئی ہے۔ مسلمان سلطنتوں میں سلطنت کے خلاف مذہبی عقائد رکھنے والوں کو جیسے کہ شیعہ اور سنی وغیرہ کا اختلاف ہے کبھی چین نصیب نہیں ہوتا تھا۔ اور مذہب کے بارہ میں آزادی سے گفت و گو کرنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ اگر سید احمد خان کسی اسلامی حکومت میں ہوتا اور مذہب میں تحقیقات کا نام لیتا اور فرسودہ عقائد پر اعتراضات کرتا تو حضرات علمائے اس کو

آروں سے چِروا دیا ہوتا۔

اس کے علاوہ جیسے کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے ہم کو صرف اپنے مذہب کی حقیقت سے آگاہ ہونے کا ہی موقعہ نہیں ملا۔ بلکہ ہم نے اپنے مذہب کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی تیاری کرنے کی فرصت پائی ہے۔ اور یہ توفیق صرف ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزی سلطنت کی بدولت ملی ہے جس نے ان کے لئے مغربی زبانوں اور مغربی علوم کی تعلیم وتحصیل کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ اشاعت اسلام ہر زمانہ میں مسلمانوں کا ان کے بادشاہوں اور خلیفہ کہلانے والوں کا سب سے مقدم اور سب سے بڑا فرض ہونا چاہئے تھا۔ لیکن یہی ایک فرض ہے جس کو مسلمانوں نے سب سے کم سمجھا ہے اور کبھی کوئی خاص توجہ اور کوشش اس کی بجا آوری کے لئے نہیں کی۔ مسلمان بادشاہوں نے ملک گیری کو ہی اپنا غرض وغایت قرار دیا اور مسلمان آپس میں ہی کٹ کٹ کر مرتے رہے اور خدا کے اس حکم کو کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کیا کہ:۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ؕ	اور تم میں ایک ایسا گروہ بھی ہونا چاہئے جو (لوگوں کو) نیک کاموں کی طرف بلائیں اور اچھے (کام) کرنے کو کہیں اور بُرے کاموں سے منع کریں۔

خدا نے اپنے سب سے آخری پیغمبر کو تمام دنیا کی طرف بھیجا تھا۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ ؕ	اور (اے پیغمبر) ہم نے تم کو تمام (دنیا کے) لوگوں کی طرف (پیغمبر بنا کر) بھیجا ہے“۔

اس کے معنے کیا تھے۔ وہ بغیر اسکے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے کہ وہ پاک نبی مسلمانوں کے ذمہ یہ کام چھوڑ گئے تھے کہ بقیہ دنیا کو یہ پیغام رحمت پہونچائیں۔ اور پھر اس سے یہ بھی مراد نہیں تھی کہ تلوار کے زور سے ملک گیری کریں بلکہ اس طریقہ کے تتبع کرنے کا ارشاد تھا جس کا حکم خود پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا۔

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ؕ	(اے پیغمبر لوگوں کو) عقل کی باتوں اور اچھی اچھی نصیحتوں سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ اور ان کے ساتھ بحث (بھی) کرو (تو) ایسے طور پر کہ وہ (لوگوں کے نزدیک) بہت ہی پسندیدہ ہو“۔

اگر گذشتہ تیرہ سو برس کے عرصہ میں مسلمانوں نے اسی ارشاد پر عمل کیا ہوتا تو کیا اس امر کی توقع کرنا ناممکن ہوتا کہ تمام دنیا اسلام کے نور سے منور ہو گئی ہوتی۔ اور دُنیا بھر میں ایک ہی برادری اسلام کی نظر آتی۔ اور دنیا اگر چاہتی تو فساد اور جھگڑوں اور قتل اور خونریزیوں سے پاک ہو گئی ہوتی۔

اب اس بات کو سوچا جائے کہ انگریزی سلطنت کا صرف ہندوستان کے مسلمانوں پر ہی نہیں بلکہ تمام دنیائے اسلام پر یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ اس کے بخشے ہوئے امن اور آزادی اور تعلیم نے ہم کو اپنے اس عظیم الشان مقدس فرض کے بجالانے کے قابل بنا دیا ہے۔ اگر ہم اب اپنے اس فرض کو پورا کرنے کی کوشش نہ کریں اور اپنی بے ہمتی اور ضعفِ ایمان کی وجہ سے کوتاہی کریں تو یہ ہماری بدبختی کا قصور ہو گا۔ لیکن اس احسان میں کوئی کمی واقع نہ ہو گی۔ ہم کو اپنے مدرسے اور اپنے کالج اور اپنی یونیورسٹی کے بنانے کی کھلی اجازت دی گئی ہے اور ان کے قائم رکھنے کے لئے ہم کو سرکار سے مدد بھی ملتی ہے۔ اگر ہم اپنے مدرسوں اور کالجوں اور یونیورسٹی سے اشاعت اسلام کے لئے تیاری کرنے کا کام نہ لیں تو یہ ہماری بدنصیبی اور سوء تدبیری کا قصور ہو گا لیکن وہ احسان جوں کا توں رہے گا۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں اس وقت ایک نہایت افسوسناک اور مایوسی بخش کیفیت نظر آتی ہے کہ جن لوگوں نے اچھی تعلیم پائی ہے اور فرض اشاعت اسلام کے ادا کرنے کے لئے عمدہ قابلیت رکھتے ہیں یا اس میں مفید مدد دے سکتے ہیں اور جن سے یہ توقع ہونی چاہئے تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس نیک اور مقدس کام پر فدا کر دیتے وہ دیگر ابنائے وطن کی طرح ہندوستان کے ملکی دھندوں میں اُلجھنے اور مسلمانوں کو ان میں اُلجھا دینے کی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے شاید اس امر کا کہ اسلام کی گرفت دلوں پر مضبوط نہیں ہے۔ اور یقیناً اس امر کا کہ انھوں نے اشاعت اسلام کے مہتم بالشان اور اہم ترین فرض پر غور نہیں کیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں جو امر ایک تمیز قائم کرتا ہے اور ان کے لئے جداگانہ راستوں کا نشان بتاتا ہے وہ یہی بزرگ کام ہے۔ ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کی غرض و غایت سوائے اسکے کچھ ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ ملکی حقوق کے حاصل کرنے کے لئے جا بے جا سلسلہ جنبانیاں کریں۔ لیکن مسلمانوں کا نصب العین اگر وہ اپنے مذہب کی کچھ پروا کریں اور اس بات کو سمجھیں کہ

جو نعمت خدا نے ان کو بخشی ہے اس کو بقیہ تمام بنی آدم تک پہونچانا ان کا فرض قرار دیا گیا ہے نہایت ارفع اور اعلیٰ ہونا چاہئے۔ جو کوششیں اس ملک کے مسلمانوں کو دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ ملکی شورش میں شریک کرنے کی کیجارہی ہیں ان کے نتائج مسلمانوں کے لئے نہایت خطرناک ہو سکتے ہیں۔ اور گذشتہ تجربہ کی بنا پر یہ آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ کم از کم سخت مخدوش اور مشتبہ ہیں۔ اس بے محل اور بے ہنگام صدا سے جو نقصان اسوقت مسلمانوں کو پہونچگیا ہے اور پہونچ رہا ہے وہ نہایت قابل تاسف ہے۔ ان کی توجہ جو تمام تر اپنی قوم کی تعلیم کی فکر میں صرف ہونی چاہئے تھی جو ان کی جملہ اغراض کا ایک ہی ذریعہ ہے پریشان ہو کر تعلیم کی طرف سے اُکھڑ گئی ہے۔ قوم میں جو پولیٹیکل واعظ پیدا ہو گئے ہیں وہ بھولے سے بھی تعلیم کا نام نہیں لیتے ہیں۔ چند تعلیم یافتہ اشخاص کو وہ اپنے گرد و پیش دیکھ کر یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ قوم کی تعلیم سے فراغت ہو چکی ہے اور اب صرف پولیٹیکل اُکھاڑے میں اُتر آنے کا کام باقی ہے۔ وہ اتنی موٹی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے پالیٹکس کی غرض و غایت صرف یہ ہونی چاہئے کہ انگریزی سلطنت پورے اقتدار اور استحکام کے ساتھ اس ملک میں قائم رہے تاکہ اس امن اور آزادی کی کیفیت میں جو اس وقت ملک میں موجود ہے کوئی تغیر واقع نہ ہو اور ہم اس فرض کو جسے ہم سب سے اعلیٰ اسلامی فرض بیان کرتے ہیں پورا کرنے کی تیاری اور اس کو عمل میں لانے کے اسی طرح قابل رہیں جیسے کہ اب ہیں۔ ہندوستان کے ملکی حقوق کی اس عظیم الشان مدعا کے سامنے جس میں ہندوستان کے اور بقیہ دنیا کے غیر مسلم لوگوں کو اسلام کی دعوت اور ہدایت کرنا داخل ہے کیا ہستی اور کیا حقیقت ہے اور اس کام کی عظمت کے سامنے بڑی سے بڑی سلطنتوں کی کیا قدر و منزلت ہے۔ یہ وہ کام ہے جس کی مثال دنیا کے اس سب سے بڑے ہادی ؐ نے جس کے ہیرو کہلانے کا ہم فخر رکھتے ہیں قائم کی ہے اور جو اس امر کو ہمارے ذمہ کر گیا تھا کہ اسلام کے اس امتیاز اور فوقیت کو اپنے عمل اور فعل سے اسکے بعد بھی ہم ثابت کر کے دکھاتے رہیں۔

مسلمانوں میں اس بات کا رونا رویا جاتا ہے کہ ان کی اپنی سلطنتیں برباد ہو گئی ہیں یا برباد ہوئی جارہی ہیں اور دنیا میں جو شان و شوکت اور دولت اور عزت انہوں نے

حاصل کی تھی وہ ضائع ہو گئی ہے لیکن اس کا ذمہ وار کون ہے۔ وہ لوگ نہایت کوتہ اندیش ہیں جو اس کا الزام کسی غیر اور خارجی چیز پر لگاتے ہیں۔ اگر خدا کا قول سچا ہے (جو یقیناً سچا ہے) تو اس کی جواب دہی خود مسلمانوں کے ذمہ ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔	"خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ آپ اپنی حالت کو نہ بدلے"۔
إِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ط	"ہمارے نیک بندے زمین کی سلطنت کے وارث ہوں گے"۔

خدا کے ان سچے احکام پر غور کرو۔ اور پھر بتاؤ کہ قصور کس کا ہے؟ اگر مسلمانوں کی حکومتیں اور سلطنتیں چلی گئیں تو قرآن مجید کے اس حکم سے ثابت ہے کہ اس سے پہلے ان سے صالحیت جا چکی تھی۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی گذشتہ حکومتوں پر نوحہ کرنے کا فائدہ اور اس سے مراد کیا ہے۔ اگر یہ مراد ہے جو درحقیقت ایک جائز خواہش ہے کہ مسلمان دنیا میں پھر عزت اور وقار حاصل کریں تو غور کرنے اور فیصلہ کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ مدعا کیوں کر پورا ہو سکتا ہے۔ آیا اس طریق سے کہ ہندوستان کے مسلمان اس ملک میں بہتر پولیٹیکل حقوق حاصل کرنے پر قناعت کر کے بیٹھ رہیں اور اسکے لئے بھی تعلیمی اعتبار سے ابھی ایک بہت بڑی تیاری کی ضرورت ہے۔ اور بے شمار خدشات اس میں لاحق ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے جن میں سے ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی قومی ہستی اور قومی امتیاز کو کھو بیٹھیں اور بعض نوجوانوں کے ناعاقبت اندیشانہ مشورہ پر عمل کر کے اپنی جداگانہ ہستی کو جو اسلام کی پیدا کی ہوئی اور خود اسلام کی ممیز اور ممتاز ہستی کا ثبوت ہے اہل وطن کی قومیت میں جذب ہو جانے دیں۔ یا اس طریق سے کہ بعض شائستہ اور حکمران اقوام کے درمیان اسلام پھیلانے کی کوشش کرنے سے اس مہذب فرمانروا قوم کا ممبر بن جانے کا استحقاق حاصل کرلیں۔ مسلمانوں کی اپنی سلطنتوں میں یہ نہیں تھا کہ ہر ایک مسلمان برسر حکومت تھا۔ اگر تھا تو یہی کچھ تھا کہ مسلمان قوم حکمران کے ہم مذہب تھی۔ اور یہ کیفیت پھر اس طرح سے بحال ہو سکتی ہے کہ ایسی اقوام میں جو ترقی یافتہ ہیں اور مضبوط اور مستحکم سلطنتیں قائم

کئے ہوئے ہیں اسلام پھیل جائے۔

لیکن درحقیقت قطع نظر اس مدعا کے بھی ہم مسلمانوں کا جیسا کہ بیان کیا گیا ہے یہ سب سے مقدم مذہبی فرض ہے کہ غیر مسلم دنیا کو اسلام کی دعوت دیں اور نتیجہ خداوند کریم کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ اگر ہم فی الواقع اسلام کو ایک ہی سچا مذہب سمجھتے ہیں تو نتیجہ کے متعلق کوئی خدشہ یا وسوسہ ہمارے دلوں میں پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جو اسلام دنیا کو اپنا یہ معجزہ دکھا چکا ہے کہ ایک یتیم بچہ نے (روحی فداک یا رسول اللہ) جسکے پاس دنیا کا کوئی سر و سامان نہیں تھا عرب جیسی جاہل اور متعصب۔ شجاع اور جنگ جو قوم سے اپنا آبائی دین چھوڑ دیا اور اس تاریک سرزمین کو اسلام کے نور سے منور کر دیا اور جو اسلام پھر اپنا یہ دوسرا معجزہ دکھا چکا ہے کہ تاتاری اور مغل جن کے ہاتھوں سے مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنتیں پامال اور برباد ہو گئی تھیں وہ اپنے آپ سے مسلمان ہو گئے اور انہوں نے پھر مسلمانوں کی عالیشان سلطنتیں قائم کیں تو اس اسلام کو پھر تیسری دفعہ وہی معجزہ دکھانے کے قابل ہونا چاہئے کہ جن اقوام نے مسلمانوں کو مغلوب کر لیا ہے وہ اس دین حق کی صداقت کی شہادت دیں اور وہ مغلوب قوم ان کی برادری میں داخل ہو جائے۔ اس علم و حکمت کی روشنی کے زمانہ میں اشاعت اسلام کا کام بمقابلہ گذشتہ زمانوں کے آسان ہو گیا ہے۔ اکثر تعلیم یافتہ لوگ خدا کی وحدانیت کا اقرار نہ کرنے سے شرماتے ہیں۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ خالص اسلام کی اصلی صورت ان کے سامنے پیش کر دی جائے۔ اور رواجی اسلام سے جو توحش ان کے دلوں میں ہے اس کے دور ہو جانے کے سامان مہیا کر دئے جائیں۔ اور غیر مسلموں کو اچھی طرح سے بتا دیا جائے کہ مذہب اسلام کا اصل اصول سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہے کہ خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا جائے اور خدائے واحد کی پرستش کی جائے۔ ہمارے اس دعویٰ کی تائید ان کوششوں سے کماحقہٗ طور پر ہوتی ہے جو یورپ اور امریکہ میں گذشتہ چند سالوں میں اشاعت اسلام کے بارہ میں کی گئی ہیں اور موجودہ بے سامانی کی حالت میں جو کامیابی وہاں ہوئی ہے کہ بڑے بڑے ذی رتبہ اور بہت بڑے پایہ کے عالم اہل یورپ نے کھلم کھلا اپنے اسلام کا اعلان کر دیا ہے تو اگر اس سب سے اعلیٰ درجہ کی نیکی کے کام کو ایک خاص اہتمام کے ساتھ اور بڑے پیمانہ پر کرنے کی تیاری کیجائے تو اسی نسبت سے ان خوشگوار نتائج کا پیدا ہونا انشاء اللہ تعالیٰ ایک یقینی امر معلوم

ہوتا ہے۔ یورپ کی موجودہ حالت بالخصوص جومادیت اور حیوانیت کے غلبہ سے ایسا نقصان اُٹھا چکی ہے اور اُٹھا رہی ہے جیسا کہ اس سے پہلے نوع انسان کو کبھی نہیں پہونچا اس امر کا بڑے زور سے تقاضا کر رہی ہے کہ اسلام کا اصلی نقشہ ان کو دکھا دیا جائے۔ اس پر خود مسلمانوں نے پورے طور پر عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ لیکن جو صداقت کے جوہر اسکی اصلی ذات میں ہیں انہیں ایک حاجت مند قوم دیکھ لے اور فیصلہ کر سکے کہ جس روحانیت کی دنیا کو تلاش اور آئیندہ مصائب سے بچنے کے لئے ضرورت ہے وہ مذہب اسلام میں موجود ہے یا نہیں۔

ہم دنیا میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کر کے دیکھ چکے ہیں اور اس تجربہ کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اسلام کی اس غرض کو کہ تمام دنیا کا مذہب اسلام ہو چنداں فائدہ نہیں پہونچایا۔ اور اسلام کے اس فرض سے جو ہمارے ذمہ تھا سبکدوش نہیں ہوئے آؤ اب عرب کے اس بے کس شریف بچے (بابی انت وامی یارسول اللہ) کی مثال کی پیروی کریں جس کی تمام طاقت اُس صداقت میں تھی جس کو اس نے بلا خوف وخطر وحشت اور باطل تعصب سے بھری ہوئی دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اور اس دنیا نے جو اس کے گرد و پیش تھی اسکو قبول کر لیا۔ اگر ہم اس وقت اپنے اس فرض کے ادا کرنے میں جسکی توفیق خدا نے صرف ہم مسلمانان ہندوستان کو عطا کی ہے اور جو تعداد میں دنیائے اسلام کے تقسیم شدہ حصوں سے سب سے زیادہ ہیں قاصر رہیں گے تو خدا گواہ ہے کہ ہم مسلمان کہلانے کے مستحق نہ ہوں گے۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ؕ

وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؕ

میں ان صفحات کے خاتمہ پر ایک اَور امر کے گذارش کرنے کا موقعہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر میری یہ رائے ہے کہ اسلام نے کوئی ایسی مذہبی خلافت قائم نہیں کی جسکی وجہ سے سلاطین ٹرکی کو تمام دنیا کے مسلمانوں پر کسی قسم کا اقتدار حاصل ہے اور جو مسلمان ان کی رعایا نہیں ہیں وہ ان کے کسی حکم کے ماننے پر مجبور کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس سے ایک لمحہ کے واسطے بھی کسی شخص کو یہ بات نہیں سمجھنی چاہئے کہ مجھ کو ترکوں کی سلطنت یا ترکی سلطنت کی مسلمان رعایا کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے۔ الا وہ ہمدردی ویسی ہی ہے جیسی کہ دیگر اسلامی حکومتوں

یا دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک دوسرے کی اس اخوت پر جو اسلام نے ان کے درمیان قائم کی ہے اور جس کو اسلام مسلمانی کی ایک علامت اور دلیل قرار دیتا ہے۔ جو دعویٰ ہے اس سے جو مسلمان انکار کرے وہ مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ اور اس امر کو سرسید احمد خان مرحوم نے اپنے مضامین میں جو ہم نے اس رسالہ میں نقل کیئے ہیں کافی طور پر واضح کر دیا ہے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں نے اکثر موقعوں پر اسکا بخوبی ثبوت دیا ہے۔ لیکن نوجوان ترکوں نے جو غالباً سلطان اور ولی عہد اور اکثر وزرا اور شیخ الاسلام کی رائے کے خلاف اس وقت یورپ کے اس معرکہ عظیم میں جرمنی کی حمایت اختیار کی ہے۔ اس نے عارضی طور پر صورت حالات کو تبدیل کر دیا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر یہ شرکت جنگ سلطان اور شیخ الاسلام اور وزراے کی رضامندی سے ہوتی یا ہوئی ہے تو اس سے کوئی مختلف صورت پیدا ہوتی بہر حال ترکوں کے اس لڑائی میں جرمنی کی جانب داری کے لئے شامل ہونے سے سلطنت ٹرکی کے مسلمانوں اور ان ممالک کی مسلمان رعایا کے درمیان جو جرمنی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں تعلقات اخوت کو اس وقت تک جب تک یہ لڑائی جاری ہے معطل کر دیا ہے۔ اور یہ ویسی ہی حالت ہے جیسے کہ دو مسلمان بادشاہوں کے درمیان لڑائی چھڑ جانے سے پیدا ہوتی۔ یہ کیفیت نوجوان ترکوں نے خود اپنے ہاتھ سے اور دیدہ و دانستہ پیدا کی ہے اور اس ناخوش گوار حالت کی جوابدہی انہیں کے ذمہ ہے۔ ترک اس بات کو جانتے تھے کہ انگلستان۔ فرانس اور روس کے زیر حکم دنیا کی مسلمان آبادی سب سے بڑا حصّہ ہے۔ اور جرمنی کی رعایا میں کوئی مسلمان نہیں ہے۔ انگلستان۔ فرانس اور روس کی رعایا کا یہ مذہبی فرض ہے کہ وہ اپنی اپنی سلطنتوں کی اطاعت اور حمایت۔ وفاداری اور فرمانبرداری کریں۔ ترکوں کو جرمنی کا ساتھ دینے کی کوئی پابندی اور مجبوری نہیں تھی۔ انگلستان اور اسکی معاون سلطنتوں کی مسلمان رعایا کے علاوہ ہندوستان کی اندرونی مسلمان ریاستیں اور بعض خارجی مسلمان حکومتیں جیسے کہ افغانستان۔ ایران اور مصر وغیرہ ہیں معاہدات کے رو سے انگلستان اور روس اور فرانس کی دوستی کی پابند تھیں اور ترکوں کا ان پر مذہبًا کوئی حق استعانت نہیں تھا۔ کیونکہ اول تو وہ کسی مذہبی لڑائی میں شریک نہیں ہوئے تھے

اور اگر مذہبی یعنی حمایت مذہب اسلام کے لئے بھی لڑائی ہوتی تو ان مسلمان حکومتوں کو قرآن مجید کے حکم کے مطابق اپنے ہم مذہب فریق کی مدد کی اجازت نہیں تھی۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ (سورہ انفال ۹)

"اگر وہ (مسلمان) مذہبی معاملہ میں تم سے امداد طلب کریں تو مدد کرنا تم پر لازم ہے لیکن اس قوم کے برخلاف نہیں جسکے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہے۔"

ترکوں کو اگر مذہب اسلام اور اس کے احکام کی کچھ پروا ہوتی اور مسلمانانِ دنیا کا کچھ بھی پاس خاطر ملحوظ ہوتا تو وہ اُس لڑائی میں ان سلطنتوں کی امداد کرتے جنکی رعایا میں کروڑہا مسلمان تھے۔ اور اگر وہ ان سلطنتوں کی امداد کرنا اپنی مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے یا نہیں کر سکتے تھے تو ان کو غیر جانب داری کی پالیسی اختیار کرنی واجب تھی جو بہت سی عیسائی حکومتوں نے اب تک اختیار کی ہوئی ہے اور ایک مسلمان سلطنت کے لئے اس پالیسی کا اختیار کرنا اس بنا پر بھی ضروری تھا کہ مذہب اسلام کے رو سے ایسی قوم کی امداد ممنوع ہے جو ظلم اور تعدی کرنے والی ہو۔ اور خود غرضی اور ملک گیری کے لئے لڑائی پر آمادہ ہو۔ جو کہ جرمنی اس وقت کر رہی ہے۔

یورپ میں اس لڑائی کے شروع ہو جانے کے بعد مسلمانان ہندوستان نے ترکوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس لڑائی میں غیر جانب داری کی وضع اختیار کریں لیکن آخر کار ترکوں نے اس مشورہ کو نہایت حقارت کے ساتھ رد کر دیا۔ اور جرمنی کی جانب داری اختیار کرنے سے انگلستان۔ فرانس اور روس کی رعایا کو ایک نہایت غیر مطبوع اور تشویشناک حالت میں ڈال دیا۔ درحقیقت ترکوں نے اس موقع پر مسلمانانِ عالم کے ساتھ اس سے بھی بڑھ کر بڑائی کی ہے۔ جرمنی نے ترکوں کو اپنے دام تزویر میں صرف اس غرض سے نہیں پھنسایا تھا کہ ان سے براہِ راست امداد حاصل کرے۔ بلکہ اس غرض سے بھی کہ سلطان ٹرکی کا جو اقتدار اسلامی دنیا میں مانا جاتا ہے اس کو استعمال کرکے قریب قریب تمام دنیا کے مسلمانوں سے اُن سلطنتوں کے برخلاف جن سے وہ وابستہ ہیں غدر اور فساد برپا کرا دیا جائے۔ یہ ایک ایسی کوشش تھی کہ اگر اس میں کامیابی ہو جاتی تو صرف ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا کہ دنیا بھر کے مسلمان خدا کے نزدیک اور اپنی اپنی سلطنتوں کی نگاہ میں مردود ہو جاتے اور دین و دنیا میں کہیں انکا ٹھکانا باقی نہ رہتا۔ خداوند کریم

ورحیم کا ہزار ہزار شکر ہے کہ جرمنی اور ترکوں کی یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی اور خدا نے مسلمانانِ عالم کی عزت و آبرو رکھ لی۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ایک وجہ ایسی موجود تھی جس سے تمام اسلامی دنیا کو ترکی سلطنت کا احترام کرنا واجب تھا۔ اور یہ اس احسان کا معاوضہ تھا جو ترکی حکومت کے حرمین الشریفین کی حفاظت کو اپنے ذمہ لینے سے پیدا ہوتا تھا۔ لیکن ترکوں نے اپنے اس حق کو بھی اپنے ہاتھوں سے تلف کر دیا ہے۔ اگر ترکوں کو ارضِ مقدس اور حرمین الشریفین کی حفاظت کی کچھ بھی پروا ہوتی تو وہ دنیا کی سب سے بڑی بحری طاقت یعنی انگلستان کے برخلاف کبھی جنگ کا نام نہ لیتے۔ بلکہ صرف اپنے اس فرض کی ادائگی کی خاطر اس زبردست سلطنت کے ساتھ ہمیشہ مستحکم دوستی قائم رکھتے۔ اُس پاک زمین کا جو مسلمانانِ عالم کا ملجاو ماوی ہے اور حرمین الشریفین کا محافظ پہلے بھی خدا تھا اور اب بھی خدا ہے اور آئندہ بھی خدا ہوگا لیکن نوجوان ترکوں نے اپنے طفلانہ بازیچہ میں اس بزرگ اور نیک کام کی اہمیت کی ذرہ بھر بھی پروا نہیں کی اور جہاں اپنے ملک کو جرمنی کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے وہاں خانہ خدا کو اور ابراہیمؑ اور محمدؐ کے ٹھکانوں کو جان بوجھکر اپنے دشمنوں کے حوالہ کر دیا ہے۔ خدا بھلا کرے انگریزی سلطنت کا جس نے اپنی مسلمان رعایا کی خاطر داشت کے لیئے خود اس امر کا اعلان کر دیا ہے اور اپنی معاون سلطنتوں کو اس امر پر رضامند کیا ہے کہ اس پاک سرزمین کو کوئی نظرِ بد سے نہیں دیکھ سکے گا۔

ترکی سلطنت کے ذمہ انگلستان کا جس نے اس کو دو دفعہ (ایک دفعہ تنہا اور ایک دفعہ فرانس کی شمولیت سے) روس کی دست برد سے اپنا خون اور روپیہ خرچ کر کے بچایا تھا۔ یہ اخلاقی فرض بھی تھا جو درحقیقت تعلیم اسلام پر مبنی ہے کہ اگر وہ روس کے اس لڑائی میں فریق انگلستان اور فرانس ہونے کی وجہ سے انگلستان اور فرانس کی مدد کر کے ان کا حق احسان ادا کرنے کے ناقابل تھے تو غیر جانب داری کا محفوظ پہلو اختیار کرتے خصوصاً اس حالت میں کہ جرمنی نے دوستی کے لباس ہی میں ترکوں کو کوئی فائدہ پہونچانے کی بجائے قریب زمانہ میں ان کو نقصان پہونچ جانا روا رکھا تھا۔ اس لڑائی سے پہلے اٹلی کا جرمنی کے ساتھ اتحاد تھا۔ اور جرمنی اگر چاہتی تو اٹلی کو طرابلس پر حملہ کرنے سے باز رکھ سکتی تھی۔ لیکن اٹلی یہ غاصبانہ فعل درحقیقت جرمنی کی اجازت اور منظوری سے

جو اس کو اتحاد کے صلہ میں یہ انعام دینا چاہتی تھی اور جرمنی کی مصلحت کی بناپر کر رہی تھی پس طرابلس ترکوں سے اگر جرمنی کے تصدق میں چھن گیا تو بلقان کی لڑائی میں بھی جرمنی نے ترکوں کی کوئی بات نہیں پوچھی تھی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر کر کے ترکوں کی سلطنت کا نفع بھی اسی امر میں تھا کہ وہ انگلستان اور اس کے معاونین سے لڑائی نہ کرتے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ترک اپنی مصلحتوں سے خود بہتر واقف ہیں۔ لیکن بظاہر کوئی ایسی مصلحت نظر نہیں آئی جس نے ترکوں کو جرمنی کا ساتھ دینے پر مجبور کیا ہو۔

سنہ ۱۸۹۵ء میں جو غلطی سلطان عبدالحمید خان سے ہوئی تھی کہ ولیم شاہ جرمنی کے دم اور دام میں آکر انہوں نے جرمنی سے راہ و رسم بڑھانی شروع کی تھی اور جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ جرمنی نے ترکوں کی سرزمین میں اپنا اسقدر اقتدار بڑھا لیا تھا کہ اس سے ترکوں کا چھٹکارا مشکل ہو گیا تھا۔ اس لڑائی نے ترکوں کے لئے یہ موقع پیدا کر دیا تھا کہ وہ خاموش بیٹھتے اور لڑائی کے انجام پر کمزور جرمنی سے اپنا پیچھا چھوڑاتے اور اپنے ملک کو جرمن دباؤ سے آزاد کرا لیتے۔ ترک اگر اس بھروسہ اور امید پر شریک جنگ ہوئے ہیں کہ جرمنی کے فتح یاب ہونے کی صورت میں ان کو کوئی فائدہ ہو گا تو ان کا یہ سودا بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ قسطنطنیہ کی خود جرمنی کو کسی اور دانشمند ملک کے مقابلہ میں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اور ترکوں کے ان ایشیائی مقبوضات کو جو قسطنطنیہ کے سامنے بہت دور تک واقع ہیں وہ قسطنطنیہ کی حفاظت کے لئے ضروری تصور کرے گی۔

بہر حال یہ امر کہ یہ باتیں درست ہیں یا یہ بات صحیح ہے کہ جرمنی کی حمایت کرنے میں ترکوں کا کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔ اسکا فیصلہ وقت کر دے گا۔ اور دنیا دیکھ لے گی کہ اگر نوجوان ترکوں نے اپنی سلطنت کو جرمنوں کے ہاتھ فروخت نہیں کر دیا تو انھوں نے معاملہ فہمی میں ایک ایسی فاش اور سخت غلطی کی ہے کہ اپنی سلطنت کو بگاڑ لیا ہے۔ اور اب صرف خدا کے اس فرمان کو پڑھ کر صبر کر بیٹھنے کے سوائے کوئی چارہ باقی نہیں رہا کہ:- "تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ" ط (ہم ان دنوں کو لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں) +

عریضہ

بخدمت جناب مسٹر ایم۔ کے۔ گاندھی صاحب

جناب من !

میں نے گذشتہ شام کو مری سے واپس آکر اخبار ٹربیون میں یہ خبر پڑھی کہ آپ راولپنڈی تشریف لانے والے ہیں۔ اور چونکہ مجھے کل صبح سے تین دن کے واسطے اپنے فرائض منصبی کے متعلق مری میں رہنا ایک امر مجبوری ہے۔ مجھے نہایت رنج ہے کہ میں اپنی ایک دیرینہ خواہش کو جو آپ سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کی تھی پورا کرنے سے محروم رہوں گا۔ مجھے اپنی بدقسمتی کا یہ واقعہ کبھی فراموش نہیں ہوگا کہ آپ جیسے ایک ممتاز بزرگ راولپنڈی تشریف لائیں اور میں دیدار کرنے سے قاصر رہوں۔

آپ کی خدمت میں حاضر ہونے اور اصالتاً آپ سے ملاقات کرنے کی خواہش میری ایک خاص غرض پر مبنی تھی اور وہ یہ تھی کہ مسئلہ **خلافت** کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ موجودہ حالات کے لحاظ سے میں آپ سے صرف اس صورت میں ملاقات کرسکتا ہوں کہ آپ تین دن سے زیادہ راولپنڈی میں قیام فرماویں اور چونکہ آپ کے پروگرام کا مجھے علم نہیں ہے۔ میں اس عریضہ کے ذریعہ سے چند ضروری باتیں اختصار کے ساتھ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ آپ ان کو نہایت غور کے ساتھ ملاحظہ فرماکر مجھے مشکور فرماویں گے۔

میں پانچ نسخے رسالہ **حقیقتِ خلافت** کے انگریزی میں اور پانچ اردو میں آپ کے ہمر رفیقوں کے واسطے پیش کرتا ہوں۔ اس رسالہ میں چند مضامین سر سید احمد خان بہادر رحمۃ اللہ علیہ کے مسئلہ خلافت کے متعلق ہیں اور اُسکے بعد چند صفحات میرے لکھے ہوئے ہیں۔ سر سید احمد خان مرحوم کی خلافت کے بارہ میں یہ قطعی رائے ہے کہ یہ کوئی مسئلہ مذہبِ اسلام کا نہیں ہے۔ اور اگر آپ مہربانی فرماکر اس رسالہ کو خاص توجہ سے پڑھیں گے تو مجھے امید ہے کہ آپ کو بھی یہ امر تسلیم کرلینا پڑے گا کہ سر سید احمد خان مرحوم کی رائے بالکل درست ہے۔

مَیں نہیں جانتا کہ آپ سرسید احمد خان مرحوم کے حالات سے کہاں تک واقف ہیں۔ لیکن ہندوستان میں تعلیم یافتہ مسلمان بہت کم ہوں گے جو کم وبیش اُن کے حالات سے واقف نہ ہوں اور شاید مَیں سب سے زیادہ اُن کے واقعاتِ زندگی اور راؤں سے آگاہی رکھتا ہوں۔ کیونکہ میں نے چند سال اُن کی خدمت میں بسر کئے اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے اُن کی سوانح عمری تحریر کی تھی۔

سرسید احمد خان مرحوم کی بابت یہ بات عموماً کہی جاتی ہے کہ وہ گذشتہ صدی کا سب سے بڑا مسلمان تھا۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ اسکی خصوصیتوں کے لحاظ سے گذشتہ ہزار برس میں بھی اس پایہ اور رتبہ کا کوئی مسلمان نہیں گذرا اور اس میں کچھ بھی مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے اور آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد مذہب اسلام کا سب سے بڑا مجدد یہی بزرگ شخص تھا۔ بہرحال یہ ایک ایسا مضمون ہے جس کی تفصیل آپ کے سامنے بیان کرنا غیر مفید معلوم ہوتا ہے اور آپ کی واقفیت کے واسطے صرف اتنا بیان کرنا کافی ہوگا کہ سرسید نے اپنی زندگی کے چالیس سال مسلمانوں کی ہمدردی۔ غم خواری۔ اُنکی اصلاح اور ترقی کی تدابیر کرنے میں گذارے۔ مسلمانوں کی سینکڑوں قسم کی ضرورتوں کو اس نے سوچا اور اُن کے پورا کرنے کی تجاویز اختیار کیں۔ مسلمانوں کی ترقی اور اصلاح کا کوئی کام نہیں ہے جسکی ابتدا اس شخص نے نہ کی ہو۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو تنزل اور برباد ی سے بچانے اور انکی ترقی کی ہر ممکن تدبیر کرنیکے واسطے اسی شخص نے ایک محکمہ قائم کردیا اور ایک بڑے زمانہ کی مخالفتوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنیکے بعد اسکو اپنے مشن میں کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ شخص صرف زبانی باتیں کرنے والا نہیں تھا۔ علیگڈھ کے مشہور کالج کی ایک ایک اینٹ اُسکے عملی کام کی گواہی دے رہی ہے۔ اس شخص نے صرف مذہب اسلام کی اصلاح ہی نہیں کی بلکہ اس مذہب کو اور اُسکے پاک بانی مذہب کو مذاہب غیر کے حملوں سے بچانے کے واسطے جو کام اُس شخص نے کیا ہے اسکی نظیریں ہماری تیرہ سو برس کی گذشتہ تاریخ میں بہت کم ملیں گی۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی اُس حالت کے لحاظ سے جو ۱۸۵۷ء کے تاسفناک حادثہ غدر کے بعد اس نے دیکھی اور انکی اصلاح اور فلاح کی جو تدابیر اختیار کیں اُن میں دو خاص باتیں تھیں جن پر وہ تمام عمر عمل پیرا رہا۔ اُن میں سے ایک تدبیر تو مسلمانوں کو علوم مغربی کی تعلیم دینے کی تھی

اور دوسری یہ کہ گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان جو بدگمانی پیدا ہو گئی تھی اُسکو رفع کیا جائے۔ سرسید کی زندگی کے آخری زمانہ میں یہ نظر آتا تھا کہ اپنے پہلے مقصد میں وہ ایک خاص حد تک اور اپنے دوسرے مدعا میں وہ پورے طور پر کامیاب ہو گیا تھا، اور غالباً یہ غرض اسکی ایسی ہی قیمتی تھی جیسی کہ پہلی۔ اس نے مسلمانوں کو انگریزی سلطنت کی برکتوں سے آگاہ کیا۔ اور مذہب کی رُو سے سلطنت کی وفاشعاری کا جو فرض اُن کے ذمہ تھا وہ اچھی طرح سے اُنکے ذہن نشین کیا۔ اُنکو سمجھایا کہ مسلمانوں کی سلطنت اِس ملک میں بگڑ جانے پر خدا نے انگریزی گورنمنٹ کو اُنپر مسلّط کرنے میں اُنپر ایک خاص رحم کیا ہے کیونکہ یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ اگر معاملہ مغلوب مسلمانوں اور غالب مرہٹوں وغیرہ کے درمیان رہ جاتا تو ہندوستان کے مسلمانوں کا بھی وہی حال ہوتا جو ہسپانیہ میں مسلمانوں کا ہوا تھا۔

یقین کیا جاتا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور انگریزی گورنمنٹ کے مابین آئندہ کوئی بدظنی اور غلط فہمی کبھی نہیں پیدا ہو گی اور انگریزی سلطنت نے جو مواقع اُن کو ترقی کرنیکے دئے ہیں اُس سے وہ مسلسل فائدہ اُٹھاتے چلے جائینگے۔ اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ اپنے آپ کو ممتاز بنا سکیں گے اور اپنے مذہب کی خوبیوں کو دُنیا پر اسطرح پر ثابت کر دیں گے کہ مذہبِ اسلام کو دنیا کی کشش کا موجب بنا دینے سے مصیبت زدہ دنیا کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کر دیں گے۔

لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ کمال بدقسمتی ہے کہ چند آدمیوں نے بعض واقعات کو اسطرح پر استعمال کیا ہے کہ سرسید کی تمام کوششوں اور اُنکے قابلِ فخر نتائج کو ملیامیٹ کر دیا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو تباہی اور بربادی کے عمیق اور ہیبتناک گڑھے کیطرف دھکیلے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔ اِنہی واقعات میں سے ایک یہ مسئلۂ خلافت ہے جسکا دیدہ دانستہ نہایت غلط استعمال کیا جا رہا ہے اور اس سے نہ صرف مذہبِ اسلام کی رسوائی کی جا رہی ہے بلکہ مسلمانوں کے واسطے ایک عظیم اور مہیب خطرہ کا سامان پیدا کیا جا رہا ہے۔ میں اس مقام پر یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جو مصیبت ترکی سلطنت پر آئی ہے کوئی مسلمان ایسا نہیں ہو سکتا جسکو اسکا رنج اور صدمہ نہ ہو۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کا حق تھا کہ وہ اپنی گورنمنٹ کو کہتے کہ اپنی مسلمان رعایا کی خاطر ترکوں کے ساتھ رعایت کا برتاؤ کریں۔ لیکن سلطنتوں کے بننے اور بگڑنے کا مسئلہ ہمارے مذہب کے رُو سے بالکل صاف ہے،

جس کا یہ حکم ہے کہ "خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو تبدیل نہ کرے" اور کہ "عزت اور سلطنت کا دینا اور لینا خدا کے ہاتھ میں ہے" اور یہ کہ "سلطنت اور حکومت خدا اُن قوموں کو دیتا ہے جنکو اُنکا اہل اور مستحق سمجھتا ہے"۔

ترکوں نے یورپ کی عیسائی سلطنتوں کے دنیاوی جھگڑے اور فساد میں دخل دیا۔ سوچ سمجھکر ہندوستان کے مسلمانوں کی درخواستوں کی پرواہ نہ کرکے جرمنی کی حمایت میں شریک جنگ ہوئے اور لڑائی کا نتیجہ اُن کے برخلاف نکلا۔ اُنہوں نے اپنی سلطنت تلوار کے زور سے پیدا کی تھی اور تلوار کے مقابلے میں ہار کر کھو بیٹھے۔ جیسی کہ اور سینکڑوں مسلمانوں کی سلطنتیں قائم ہوئیں اور بگڑ گئیں۔ رسالہ **خلافت** کے پڑھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ جس چیز کو خلافت کہا جاتا ہے وہ بھی ترکوں نے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہاکر لی تھی اور اگر اسکی کوئی حقیقت تھی تو تلوار ہی نے اُن سے چھین لی ہے۔

چونکہ میں نے آپ سے رسالہ خلافت کے توجہ سے پڑھنے کی درخواست کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اِسے ضرور پڑھینگے۔ اسلئے خلافت کے متعلق اِس عریضہ میں کوئی خاص ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن مَیں چاہتا ہوں کہ اس امر کو اچھی طرح سے آپ کے ذہن نشین کردوں کہ ہر ایک مسلمان جو اپنے مذہب سے صحیح واقفیت رکھتا ہے اس بات سے انکار نہیں کرے گا کہ ہماری مقدس کتاب قرآن مجید میں کسی اسلامی خلافت کا کوئی ذکر بجز اسکے نہیں ہے کہ "اگر مسلمانوں کے اعمال صالح ہوں گے تو خدا اُنکو اسی طور پر حکومت دے گا جیسے کہ اُن سے پہلے دیگر اقوام کو دیگئی تھی"۔ یہ ایک عام حکم ہے۔ اور مدعیانِ خلافت کو اعمال صالح پیدا کرنے چاہیئے اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ اعمال صالح کیا ہیں۔ اسکے سوائے بعض احادیث یعنی اقوال جناب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اِن تمام احادیث کی نسبت سرسید احمد خاں مرحوم اور اُن کے جانشین نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علیصاحب مرحوم نے اچھی طرح سے یہ ثابت کرکے دکھادیا ہے کہ وہ تمام احادیث وضعی ہیں۔ اور اُن زمانوں میں وضع کی گئی ہیں جب بنی امیہ۔ بنی عباس اور بنی فاطمہ کے درمیان سلطنت کے واسطے لڑائیاں ہو رہی تھیں۔

خلافت کی حقیقت کے سمجھنے میں صرف مسلمانوں کی تاریخ سے مدد مِلسکتی ہے مگر بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارے عُلما اور انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان دونوں اسلامی تاریخ سے

اس وجہ سے ناواقف ہیں کہ یہ مضمون نہ تو پرانے نصابِ تعلیم میں داخل ہے اور نہ انگریزی
مدارس اور کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنیکے بعد کوئی شک
اس بارہ میں نہیں رہ سکتا کہ خلافت مذہب اسلام کا ہرگز کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں
مثال کے طور پر ایک واقعہ اس موقعہ پر بیان کرتا ہوں۔

جناب رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے رحلت فرما جانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ اُن کے
پہلے خلیفہ ہوئے۔ اور اڑھائی سال تک خلیفہ کہلاتے رہے۔ اُن کی وفات پر جب حضرت
عمرؓ ان کے جانشین ہوئے تو انہوں نے مسلمانوں کو منع کیا کہ ان کو خلیفہ نہ کہیں اور اسکی
بجائے امیر المؤمنین کا لقب اختیار کیا۔ حضرت عمرؓ اپنے اوصاف میں بے مثل تھے۔ انکے
ہاتھوں سے وسیع اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑی اور جناب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
اُن کی نسبت یہ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر میرے بعد کوئی پیغمبر ہوتا تو عمرؓ ہوتا"۔ پس حضرت
عمرؓ کے لقبِ خلافت کو دیدہ دانستہ ترک کرنے میں ضرور کوئی مصلحت تھی اور اس
مصلحت کا ثبوت اس وقت مہیا ہو رہا ہے۔

حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ نے بھی امیر المؤمنین کہلایا۔ اور حضرت علیؓ نے بھی
حتیٰ کہ جب سلطنت بنی امیہ کے ہاتھ آگئی۔ تو بنی امیہ کے پہلے تاجدار معاویہؓ نے بھی
امیر کہلایا۔ ان سب کے بعد جس شخص نے خلیفہ کا لقب پھر اختیار کیا وہ معاویہؓ کا بیٹا
یزید تھا۔ جس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہونے کا حق اسطرح ادا کیا کہ
حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پیارے نواسے امام حسینؓ کو اور انکی تمام اولاد کو
دشتِ کربلا میں شہید کر دیا۔ اور اسلامی دنیا میں ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو ملعون
بنالیا۔

ایک اور تاریخی واقعہ جو آپ کو خلافت کی حقیقت سمجھنے میں مدد دے گا وہ یہ ہے کہ
ایک ہی وقت میں بغداد۔ مصر۔ اور ہسپانیہ کے تین مسلمان بادشاہ خلیفہ کہلاتے تھے
اس سے آپ اندازہ کرسکیں گے کہ خلیفہ کے معنے صرف بادشاہ کے ہیں اور ایک وقت
میں ایک سے زیادہ خلیفہ ہو سکتے ہیں۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ مسلمانوں کا ایک ایسا خلیفہ ہونا چاہیئے جس کو دنیوی

جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی جاتی ہے۔ جسکا مضمون یہ ہے کہ خلافت صرف قریش کے واسطے ہے۔ یعنی اُس قوم کے واسطے جس میں سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ مصر میں دولتِ الیوبیہ کے ختم ہو جانے پر جو مشہور سلطان صلاح الدین نے قائم کی تھی۔ جب مملوکوں کی سلطنت قائم ہو گئی تو اس وقت بغداد کی خلافت بنی عباس کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ چونکہ اُس وقت یہ عقیدہ تھا کہ خلیفہ صرف قریشی ہو سکتا ہے اسواسطے بنی عباس کی قوم سے کسی شخص کو تلاش کر کے اُسکے قریشی ہونے کی وجہ سے اُسکو خلیفہ بنا دیا گیا اور قریبًا تین صدیوں تک یہ خلافت قائم رکھی گئی۔ اِن خلیفوں کو سلطنت کے کاروبار میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ اور ایک مذہبی مقدس وجود کی شکل میں تنہائی میں زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک نئی بات جو اس وقت مسئلہ خلافت کے متعلق ظہور میں آئی ہے وہ آپ کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ شمس العلما مولانا شبلی نعمانی مرحوم کا ایک مضمون علیگڈھ گزٹ کی ایک تازہ اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ یہ بزرگ شخص مسلمانانِ ہندوستان میں تاریخ اسلام کے سب سے بڑے ماہر ہیں۔ اور خلافت کی شورش کے سب سے بڑے سرگرم بانی اور حامی خواہ وہ ہندوستان میں ہیں یا وفد خلافت میں یورپ کو گئے ہوئے ہیں وہ سب جناب مولانا شبلی مرحوم کے شاگرد ہیں۔ مولوی شبلی صاحب کی رائے خلافت کے بارہ میں یہ ہے کہ خلافت صرف قریش کی ہو سکتی ہے کسی غیر قریش کی نہیں ہو سکتی اور اسوجہ سے وہ ترکوں کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ اگر اس وقت وہ زندہ ہوتے تو شاہ حجاز کو جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اولاد اور قریش سے ہیں خلیفہ تسلیم کر لیتے۔

شیعہ مسلمان تو کسی خلافت کے قائل نہیں ہیں۔ اور سُنی مسلمانوں کا تمام گذشتہ زمانہ میں یہ عقیدہ رہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تیس سال بعد خلافت ختم ہو گئی اور محض بادشاہی شروع ہو گئی۔ یہ عقیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اسی مضمون کی حدیث پر مبنی ہے۔ اور آج بھی تمام ممتاز سُنی علما کا جو اپنے مذہب کی نسبت کچھ جانتے ہیں اسی حدیث پر ایمان ہے۔ اور جانتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے نواسے حضرت امام حسنؓ کے خلع خلافت کرنے پر جو آنحضرتؐ سے تیس سال بعد ہوا۔ خلافت ختم ہو چکی ہے۔

بہرحال خواہ جناب مولوی شبلی صاحب مرحوم کی رائے درست ہو کہ خلافت صرف قریش کا

حق ہے خواہ یہ حدیث صحیح ہو۔ کہ خلافت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے تیس سال بعد ختم ہو چکی ہے اور خواہ سر سید احمد خان رحمۃ اللہ علیہ کی رائے حق پر ہو کہ خلافت مذہب اسلام کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ترکوں کی خلافت کا کوئی وجود احکام مذہب اسلام کے رُو سے ثابت نہیں ہوتا، جن مسلمان اخبارات نے سرسید کے مضامین خلافت پر اظہار رائے کیا ہے اُنہوں نے ایک نہایت رکیک اور شرمناک بات کہی ہے کہ سرسید کی رائے در اصل یہ نہیں تھی۔ بلکہ مسلمانوں کی توجہ کو تعلیم پر جمائے رکھنے کے واسطے خلافت کے وجود سے انکار کر دیا تھا۔ سرسید کو ہندوستان کے وہی چند مسلمان اخبارات بد دیانت کہہ سکتے ہیں۔ جن کو خود دیانتداری کے معنے معلوم نہیں ہیں۔

اگر ہندوستان کے وہ مسلمان جنہوں نے خلافت کا شاخسانہ کھڑا کیا ہے یہ بات کہیں کہ کسی ایسی خلافت کا قائم کرنا جیسی کہ وہ بیان کرتے ہیں اُن کے نزدیک مصلحتِ وقت ہے تو ان کو ایسا کرنے کا اختیار ہے اور آپکو بھی اختیار ہے کہ انکی اس قسم کی تجویز کے ساتھ اتفاق کریں اور شورش کریں۔ لیکن یہ حق کسیکا نہیں ہے کہ بغیر تحقیقات کے محض پولیٹیکل ایجی ٹیشن کی غرض سے خلافت کو ایک بہانہ بنا لیا جائے۔ اور مسلمانوں کی غریب اور بدنصیب قوم کو اس ملک میں برباد اور ان کے مذہب کو بدنام اور رسوا کیا جائے۔ جو لوگ محض ناخواندہ اور مذہب کی تعلیم سے بے بہرہ ہیں ان بے چاروں کو تو چھوڑ دیجئے۔ جو نام نہاد لکھے پڑھے لوگ خلافت کے جلسوں میں شامل ہوتے ہیں ان میں سے ایک ایک کو اپنے سامنے بُلا کر خلافت کی حقیقت کے متعلق ان سے دریافت فرمایئے تو آپ کو یقین ہو جائے گا کہ خلافت کی نسبت آپ کو صرف دھوکھا دیا گیا ہے۔ یہ ایک بالکل بے اصل اور بے معنے تحریک ہے۔ بعض اخبار نویسوں نے بڑی تلاش سے خلافت کے ثبوت میں ایک واقعہ تاریخی پیش کیا ہے کہ ہندوستان کے کسی بادشاہ نے خلیفہ مصر یا بغداد سے ایک خط اور خلعت حاصل کرنے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اُنکو یہ معلوم نہیں ہے کہ ہندوستان کا ایک جلیل الشان اور عالم مذہب بادشاہ خود مدعی خلافت کا تھا۔ یا خلافت اور سلطنت کو وہ ہم معنے الفاظ سمجھتا تھا۔ یہ ایک مغل بادشاہ تھا۔ اسکا نام اورنگ زیب اور لقب عالمگیر تھا۔ اسکے رقعات چھپے ہوئے بہت لوگوں نے پڑھے ہوں گے لیکن انکو یہ یاد نہیں رہا کہ اپنے بڑے بیٹے کو وہ "مہیں پور خلافت" لکھا کرتا تھا۔

ہمارا عقیدہ اپنے مذہب کے متعلق یہ ہے کہ وہ دنیا میں سب سے آخری مذہب ہے کیونکہ وہ سچا مذہب ہے۔ اور اسکے سچا ہونے کی ایک دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ اسکا ہر ایک حکم اور مسئلہ معقولیت پر مبنی ہے۔ کیا اُس مذہب کو بھی معقول اور سچا کہا جاسکتا ہے جو یہ تعلیم دے کہ ہم رعایا تو ایک سلطنت مثلاً انگریزی۔ فرانسیسی یا روسی کے ہوں اور اطاعت ایک دوسری سلطنت کی کریں خواہ وہ مسلمان ہی ہو۔ حکومتیں تمام دنیاواری کے قصے ہیں۔ یورپ اور ہسپانیہ کی تاریخ پر غور کر کے دیکھا جائے تو مسلمان مسلمانوں کے ساتھ عیسائی حکومتوں کی حمایت میں لڑتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اتنے پرانے زمانہ کی تاریخ کی تلاش میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یورپ کی اسی جنگ کی کیفیت پر غور کیجئے۔ ترک اگر جرمنی کی حمایت کے واسطے اُٹھ کھڑے ہوئے تو کیا انگریزی۔ فرانسیسی اور روسی مسلمان رعایا اپنی اپنی حکومتوں کی طرف سے جرمنی اور ٹرکی کے ساتھ لڑنے کے واسطے نہیں گئے ہیں؟ اور کیا یہ آدھی درجن آدمی جو شورش خلافت کے بانی ہیں مذہب اسلام کے احکام کو باقی کروڑوں مسلمانانِ عالم سے بہتر جانتے ہیں؟۔

ہندوستان کے ہر شخص کو معلوم ہے اور آپ بھی جانتے ہیں کہ بانیانِ شورش ایسے اصحاب ہیں جو گورنمنٹ کے عتاب یافتہ ہیں اور گورنمنٹ سے اُنکو سخت شکایت ہے۔ پس اس شورش کی اصلیت پر غور کرنے کے وقت یہ واقعہ آپ کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ یہی وہ چند اصحاب ہیں جنھوں نے بعض اخبارات کے ذریعہ سے اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن کو انکی بےنظیر اسلامی خدمات اور نہایت فیاضی اور دریا دلی سے مسلمانانِ ہندوستان کی امداد اور سرپرستی فرمانے کے صلہ میں **محی الملت والدین** کا لقب پیش کیا تھا اور آج وہ لقب اُن سے واپس لیا جارہا ہے۔ کیونکہ شورش خلافت سے وہ متفق نہیں ہیں۔ یہ بزرگوار یہ چاہتے ہیں کہ جہاں مسلمانانِ ہندوستان برباد ہوں وہاں یہ ہندوستان کی اسلامی سلطنت بھی جو ہر زمانہ میں مسلمانانِ ہندوستان کی پشت وپناہ اور ان کے لئے چشمۂ فیض ثابت ہوئی ہے خدانخواستہ دگرگوں ہوجائے۔ کیا خلافت کی شورش بھی ایک ایسا ہی بازیچۂ طفلاں نہیں ہے؟۔

کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان یہ شورش اس بنا پر کر رہے ہیں کہ اُنھوں نے جنگ میں اپنی سلطنت کی خدمت کی ہے اور اسکا صلہ مانگتے ہیں۔ پہلے تو ان بانیانِ شورش سے یہ دریافت فرمایئے کہ زمانہ جنگ میں وہ کہاں تشریف رکھتے تھے؟ اور مہربانی کر کے ان کی نوعیت خدمات ان سے [illegible] معلوم کرنے کی ضرورت ہوگی کہ جنگ میں خدمت کرنے والوں میں سے

کتنے آدمی ان کے ساتھ اس شورش میں شامل ہیں۔ اور نیز یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سوائے فرانس اور روس کی مسلمان رعایا میں ایسی ہی شورش کی جارہی ہے یا یہ محض ہندوستان کے ساتھ مخصوص اور محدود ہے۔

غیر سلطنتوں کی مسلمان رعایا کو تو جانے دیجئے۔ خود ترکوں کے اپنے حالات پر غور فرمائیے شرائط صلح میں جس ترمیم کی ترکوں نے درخواست کی ہے کیا ہندوستان کے شورش کنندگان کا بھی وہی مطالبہ ہے؟ کیا ترکوں نے۔ مصر۔ حجاز۔ فلسطین۔ طرابلس۔ شام اور عراق کی خود مختاری کو تسلیم نہیں کر لیا؟ کیا وہ دعویٰ خلافت کی بنا پر حجاز کو یا کسی مقدس سرزمین کو واپس طلب کر رہے ہیں؟۔ اب ہندوستان کے بانیان شورش نے وزیر اعظم ترکی کو گالیاں دینی شروع کر دی ہیں کہ وہ غداری کر رہا ہے اور جو کچھ ہندوستان کی شورش والے طلب کرتے ہیں وہی مطالبہ وہ کیوں نہیں کرتا؟ ہمکو امید ہے ہندوستان کے اہل شورش وہ وکالت نامہ پیش کر سکیں گے جو ترکوں نے ان کو اپنی جانب سے مطالبات کرنے کے واسطے دیا ہوا ہے۔

اس شورش کی لغویت اور کھوکھلا پن اس واقعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر درحقیقت کسی شخص کا یہ منشا تھا کہ ایک اسلامی طاقتور حکومت حرمین الشریفین کی حفاظت کیواسطے قائم ہو جائے تو اسکا صرف یہی طریقہ نہیں تھا کہ ترکوں کے واسطے ایک گونہ محال مطالبات پیش کئے جائیں۔ بلکہ ایک دوسرا انسب طریقہ یہ تھا کہ شاہ حجاز کی سلطنت کی توسیع کی درخواست کی جاتی۔ اور شام کا جو حصہ فرانس کے لئے تجویز کیا گیا ہے اور فلسطین وغیرہ عربوں کی سلطنت میں داخل کئے جانے کی خواہش کی جاتی۔ لیکن اہل شورش تو شاہ حجاز کو جو جناب رسول کریم صلعم کی اولاد سے ہیں اور قریش ہیں اور جن کا حق ترکوں نے صدیوں تک مولانا شبلی کی رائے کے مطابق غصب کئے رکھا ہے باغی اور غدار کہتے ہیں۔ اور جب تک ترکوں کی حکومت حجاز میں قائم نہ ہو جائے آئندہ کسی مسلمان کے حج کرنے جانے کو کفر بتاتے ہیں۔ اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ عربوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا جنھوں نے زمانۂ جنگ طرابلس اور یورپ کے جنگ عظیم میں مسلمانوں کے مقدس مقامات کی حفاظت اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ گویا شورش کرنے والوں کے مذہب میں ترکوں کے جرمنی کی حمایت میں شریک جنگ ہونے کا حکم تو موجود ہے لیکن عربوں کا انگریزوں کی مدد کرنا جرم ہے۔ انکو یہ یاد نہیں رہا کہ ترکی سلطنت اور اسکے ساتھ ہی انکی خلافت آج سے ستر برس پیشتر غائب ہو چکی ہوتی اگر انگریز ترکوں کی امداد روس کے مقابلہ میں دو دفعہ

اور محمد علی والی مصر کے مقابلہ میں تیسری دفعہ نہ کرتے۔

مجھ کو اندیشہ ہے کہ میری یہ چٹھی بہت لمبی ہو گئی ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے مسلمان دوستوں کو یہ سمجھائیں کہ وہ ترکی کے بچانے کے واسطے ایسے طریقے اختیار نہ کریں جنسے ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان برباد ہو جائیں۔ ہندوستان کے مسلمان مفلس ہیں۔ بے ہنر ہیں اور تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ جو روپیہ انکی تعلیم اور ترقی میں صرف کیا جا سکتا ہے وہ ان غریبوں سے لیکر ضائع نہ کریں خلافت کی شورش نے انکو تعلیم اور ترقی کے راستہ پر سے اُکھیڑ دیا ہے۔ انکو فتنہ اور فساد برپا کرنے کے لئے برانگیختہ کیا جا رہا ہے۔ فتنہ اور فساد برپا کرنے والوں کی بابت اُنکی پاک مذہبی کتاب میں جو حکم ہے اُسکی طرف انکو توجہ دلائیں جو حسب ذیل ہے:۔

"اور جو لوگ فساد پھیلانے کی غرض سے ملک میں دوڑے پھرتے ہیں اُنکی تو سزا بس یہی ہے کہ کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دئے جائیں۔ یا انکو سولی دیجائے۔ یا انکے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کاٹ دئے جائیں یا انکو دیس نکالا دیا جائے۔ یہ تو دنیا میں اُنکی رسوائی ہے اور اسکے علاوہ آخرت میں بھی اُنکے لئے بڑا عذاب تیار ہے"۔

مجھ کو اُمید ہے کہ میرے اس عریضہ کے ملاحظہ اور رسالہ خلافت کے پڑھنے کے بعد کم از کم آپ اس شورش میں حصہ لینے سے دستکش ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس سے آپ پر یہ امر تو واضح ہو جائیگا کہ اس مسئلہ میں تمام مسلمان باہم متفق نہیں ہیں اور آپکا کوئی حق نہیں ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق اپنے آپ کو حکم قرار دے لیں اور یہ فیصلہ کریں کہ مختلف فریقوں میں سے درستی پر کون ہے۔ میری اسوقت تک یہی رائے ہے کہ آپ دھوکہا میں آکر مسلمانوں کی ہمدردی کی بناپر اس شورش میں شریک ہو گئے ہیں۔ لیکن اگر آپنے اسکے بعد بھی شرکت شورش پر اصرار کیا تو آپ اس تباہی اور مصیبت کے ذمہ دار ہونگے جو اس شورش کے سلسلہ میں بعض انتہائی اور نہایت خطرناک تدابیر اختیار کرنے سے مسلمانوں پر نازل ہونے والی ہے اور جو تمام دور اندیش مسلمانوں کو نظر آرہی ہے اور ہندوستان کے آئندہ مؤرخ کو یہ بات کہنے کا حق حاصل ہو جائیگا کہ مغلیہ سلطنت کے خاتمہ پر جو کام فتحمند مرہٹوں وغیرہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کو برباد کرنے کا نہیں ہو سکا تھا کیونکہ انگریزی سلطنت نے انکو بچا لیا تھا وہ آپ کے ہاتھوں سے پورا ہو گیا۔

راقم آپ کا نیاز مند

خاکسار سراج الدین احمد۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ راولپنڈی۔ ۱۰ جولائی ۱۹۲۰ء

غلط نامہ رسالۂ عملیہ
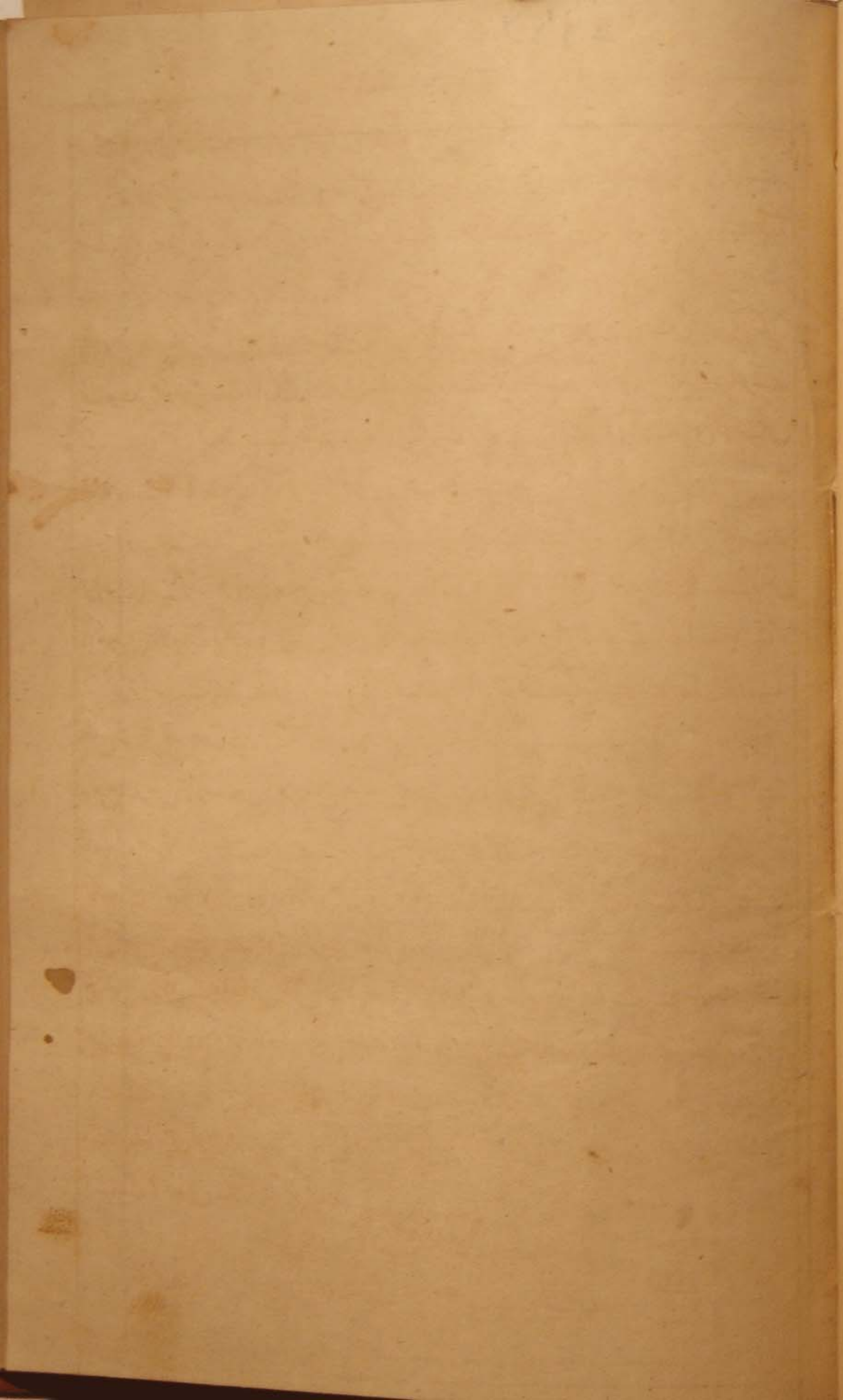
صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۷	کھینچنا چاہین	کھینچنا چاہیے
۵	۲	مان باپ	مان یا باپ
۷	۸	درد ہو	درد ہوا ہو
۷	۱۷	ہو احتیاطاً اور یہی	ہو اور احتیاطاً یہی
۸	۱۶	ہین حرام	بحرام
۸	۱	کہ جیسا	جیسا کہ
۹	۱۰	برتن کو چاٹے	برتن مین پئے یا چاٹے
۹	۱۹	ہو تو بعد	ہو بعد
۱۰	۳	کہ نجاست	کہ یہ نجاست
۱۰	۱۷	پاک ہو جائینگے	پاک ہو جائے گا
۱۱	۱۲	ہین کیونکہ	ہین اور ملوث بغسالہ نجس ہین کیونکہ
۱۲	۷	ہین بھی اور	ہین بھی احتیاطاً اور

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳	۴	ہاتھ مین	ہاتھ سے
۱۳	۱۰	ادا ہو یا قضا اور استدامت نماز	اور واجب ہے استدامت نماز قضا اور نماز
۱۸	۱	جائے تیسری	جائے قبل مسح تیسری
۱۸	۲	اور مسح مین	اور مسح مین بھی ترتیب
۱۹	۱	آب مطلق	آب یا آب مطلق
۱۹	۱۵	اور وضو کرلے تو	اور بعد فراغ علم حاصل کرے تو
۲۰	۳	قضا ہو	قضا نہ ہو
۲۰	۳	اگر قصد	اگر قضا ہو اور قصد
۲۰	۵	یا بہ حصول	یا بقصد حصول
۲۰	۸	جائز ہوگا	جائز ہے
۲۰	۱۶	نہ ہونے پائی	نہ ہونے پایا ہو
۲۱	۶	نہ جانتا ہو کہ	نہ جانتے ہون کہ
۲۱	۱۴	غسل ہے کے	غسل جنابت یا حیض یا نفاس کے
۲۳	۱۱	اور غسل واجب	تو غسل اوسپر واجب

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۶	۱	سابق مین ہو	سابق مین نہو
۲۶	۱۰	کرے اور	کرے اور ضمنا
۲۷	۸	مین بنتا	مین بنا
۲۸	۴	اور ربل	اور رل
۲۸	۵	غمد	نمد
۲۹	۵	کہ جبین	کہ جبینین
۲۹	۱۸	ہے اگرچہ	ہے بمعنے پے در پے اگرچہ
۳۰	۳	اعتبار	حسال
۳۰	۱۳	باقضا	یا قضا
۳۰	۱۵	کرنے کا	کرنے مین
۳۱	۵	مسجد بنجاست	مسجد بہ نجاست
۳۱	۶	ساوے	مسادی
۳۱	۸	عبد	عہد
۳۱	۱۶	اعادہ یا قضا کرے	اعادہ کرے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۴	۶	اور دس دن یا کمتر دس دن کو دیکھے	اور دس دن کے دیکھے
۳۴	۸	تیسرے ا	تیسرے
۳۴	۱۰	صورتون مین جمع	صورت نقاء متخلل بین عشرہ مین
۳۴	۱۴	ختم ہوتا ہے	ختم ہونا ہے
۳۴	۱۴	تمام ہوتا ہے	تمام ہونا ہے
۳۵	۱۲	عادت کو چاہیے	عادت عددی و وقتی یا وقتی کو چاہیے
۳۵	۱۳	پس اگر ایک دو روز	اگرچہ ایک دو روز
۳۵	۱۳	خون دیکھے	یا بعد عادت خون دیکھے
۳۵	۱۳	نہ ہو تو بھی	نہ ہو تو بھی جب تک یقین نہ کرے کہ حیض نہین آئیگا اگر
۳۵	۱۴	احوط ہے کہ افعال	احوط ہے خصوص جبکہ خون بصفت حیض ہو کہ افعال
۳۶	۳	عبادت وغیرہ کے ترک کرنے مین	عبادت کے کرنے مین
۳۶	۴	بلکہ احوط ہے	اور بعد اسکے احوط ہے
۳۶	۵	رکھے گا یا نہ رکھے گا	رکھے گا اور تمیز موافق عادت ہوگا
۳۶	۶	پس صاحب عادت	تو دو نو صورت مین صاحب عادت

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۶	۷	مخالف ہو	مخالف عادت کے ہو
۳۶	۸	کرنا خالی	کرنا اگرچہ خالی
۳۶	۱۱	درصورت عدم تمیز	اگر عادت غیر تمیز سے ہو
۳۶	۱۱	احوط جمع ہے	احوط رعایت احتیاط ہی دونو خونمین
۳۶	۱۶	اور اگر خون منصف	اور جبکہ خون منصف
۳۶	۱۶و۱۷	جمع کو ترک نہ کرے	جمع کرنا ہے
۳۷	۱۰	اور یہ حکم ہے اگر عادت یا عدد وقت	اور یہ حکم اوسکا ہی کہ جو عادت کو یا وقت و عدد
۳۷	۱۹	حائض حالت	حائض حالت حیض مین
۳۹	۶	معتیر	معتبر
۴۰	۳	قراز	قرار
۴۰	۱۲	دس رور	دس روز
۴۰	۱۲	جو شرائط	جو بشرائط
۴۰	۱۷	تو زیادہ جوا نمین سے عادت رکھتی ہو اوسپر عمل	تو اکثر کے عادت پر عمل
۴۰	۱۹	اگر عدد معلوم	اگر عدد معلوم ہو

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۱	۱	نخیر ہے	تخییر ہے
۴۱	۸	توبہ مسقط	توبہ مسقط
۴۱	۱۸	مخیر بین	مخیر بین
۴۲	۳	عزیمہ	عزیمہ
۴۲	۶	تو احتیاطاً غسل کر لیوے	تو غسل کرے
۴۲	۱۳	دس روز سے پہلے	دس روز گذرنے سے پہلے
۴۲	۱۷	مفدغ او	مضغہ ہو
۴۳	۵	اور اس پہ منقطع	اور منقطع
۴۳	۶	سے تجاوز ہو	سے متجاوز ہو
۴۳	۸	تو تمام زمان نفاس تمام ہوگا	تو وہ تمام مقدار نفاس ہوگا
۴۴	۱۳	تولد طفل	تولد تمام طفل
۴۴	۱۴	تو بھی	تو یہی
۴۷	۱۵	کو تمام کرے اعادہ غسل کرے	کو اعادہ کرے
۴۷	۱۶	واجب ہے	واجب باشرط ہے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۸	۹	جو گندہ	جو کندہ
۴۸	۱۲	کوئی دیدے گا	کوئی غسل دیدیوے
۴۸	۱۷	ارحام مین	ارحام ہین
۴۹	۷	میت سے رکھتا ہو	میت سے قرابت رکھتا ہو
۴۹	۱۰	کے حکم	کے بغیر حال ضرورت مین حکم
۴۹	۱۱	دیسکتا ہے اور	دیسکتا ہی جیسا کہ پسر ۲ سالہ کو عورت غسل دیسکتی ہے اور
۴۹	۱۶	استخوان وگوشت	استخوان بے گوشت
۵۰	۸	اوسطرح پر	اوسیطرح پر
۵۱	۹	اوسے	اوسکے
۵۲	۸	چھپا رہنا چاہیے	چھپاوے
۵۳	۱۶	ولواپس مین محرم	اگر غیر محرم
۵۳	۱۸	میت پر ہنا	میت پڑہنا
۵۳	۱۹	خواہ خود	خود
۵۴	۵	اشکالی کیا ہے	اشکال ہے

صحیح	غلط	سطر	صفحہ
باذن	بادن	۹	۵۴
مُحَمَّدٍ وَ	مُحَمَّدٍ و	۱۸	۵۴
الْمَيِّتَةِ	الْمِيتَهِ	۱	۵۵
لِاَبَوَيْهِ وَلَنَا	لَنَا وَلِاَبَوَيْهِ	۴	۵۶
اِنْ كَانَ	اِنْكَانَتْ	۸	۵۶
سَبِيْلَكَ	بِسَبِيْلِكَ	۱۰	۵۶
نماز میت مین	میت کا نماز مین	۱۱	۵۶
نماز پڑھوانیوالیکے اگر امام ہو داہنے	نماز پڑھنے والے کے داہنے	۱۲	۵۶
مصلے سے اگر امام ہو ہونا	مصلے سے ہونا	۱۶	۵۶
مسلہ	مسلہ	۱۸	۵۷
عِنْدِ اللهِ	عِنْدَ اللهِ	۵	۵۹
رَحْمَتِهٖ	رَحْمَةِ	۱۱	۶۰